بکھرے خیالات

(اقبال کی ڈائری)

مترجم

ڈاکٹر عبدالحق

شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

بکھرے خیالات

(اقبال کی ڈائری)

STRAY REFLECTIONS

کا ترجمہ

از

ڈاکٹر عبد الحق

شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی دہلی

بزمِ احباب دہلی

ناشر۔ مسعود احمد، پہاڑ پور، مچھلی شہر، جون پور (یو۔پی)
مارچ ۱۹۷۵ء
تعداد۔ پانچ سو
قیمت۔ پندرہ روپے
جمال پریس، جامع مسجد، دہلی۔ ۶

برادرِ مکرم

عبدالوحید صاحب کے نام :

"بنایا جس کی مُروّت نے نکتہ داں مجکو"

ترتیب

مقدمہ

از

مترجم

اقبال برصغیر کے عظیم ترین فن کار اور دانائے راز ہیں - اور یہ عظمت فکر کی بلندی و برنائی ، وسعت و گہرائی اور شعری اسلوبِ اظہار کے دلاویز پیکروں سے مربوط ہے۔ شعر و فلسفہ کا یہی خوب صورت ارتباط ہے - جو اقبال کو عظیم ترین فن کار بناتا ہے - یہی حُسنِ امتزاج یا ارتباط ہے - جو ان کی فکری یا شعری کوتاہیوں کو بے معنی بنا دیتا ہے - یہی سبب ہے کہ تنقید و تبصرہ کی سخت گیری بھی اقبال کی عظمت کے جادو اور اس کے اثر کو زائل نہ کر سکی - بلکہ ان کی عظمت کے اقرار و اعتراف کا دائرہ وسیع تر ہو رہا ہے - منکر مبلغ کی صورت میں اور تنقیص، تحسین میں بدل رہی ہے - یہ اقبال کی آفاقی اور دوامی شہرت کی ایک دلیل بھی ہے - فلسفہ و شعر کے اس حسنِ امتزاج کے پہلو بے حد متنوع ، دل کش، ہمہ گیر اور قدرے پیچیدہ ہیں - فلسفیانہ طرزِ فکر اور شعری اسلوبِ اظہار

نے اس پیچیدگی میں اضافہ کیا ہے۔ اقبال کے ہاں افکار کا
تلاطم اور ابلاغ کے لئے الفاظ کی کم مایگی کا اکثر احساس ہوتا
ہے۔ سینے میں شمعِ نفس کا فروزاں ہونا اور تابِ گفتار کا بس
کہنا اسی دل کش حُسنِ امتزاج کی عظمت کا ایک اظہار ہے،
جہاں فلسفہ و شعر حرفِ تمنا بنتے ہیں اور جسے رو برو کہنے میں
احساسِ ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اقبال کے
افکار و آرا کی ترجمانی و ترسیل میں ہماری ذمہ داری کئی گنا بڑھ
بڑھ جاتی ہے۔

یہ بات بڑی جرأت کا تقاضہ کرتی ہے کہ برصغیر
کے اس دانائے راز کے تصورات کو حرفِ آخر مان لیں اور
تنقید و تبصرہ سے دست بردار ہو جائیں۔ اقبال کے مطالعہ و
مُشاہدہ، ادراک و وجدان میں وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کوئی بھی
شئے حرفِ آخر نہیں۔ فکرِ اقبال میں یہ تصوّر بھرپور شعری لطافتوں
اور افکار کی گہری فکر انگیزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان
کے نزدیک کاروانِ وجود ہر لمحہ نئی تخلیقات سے ہم کنار ہوتا
رہتا ہے۔ یہ تخلیق مادے کی حیات بخش نمو پذیری اور فکری
یافت و انکشاف میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اقبال کے
نزدیک اس سلسلۂ خیال کا سرچشمہ "کل یوم ھو فی الشان"
کی حکیمانہ آیت ہے۔ جسے اقبال نے تواتر و تسلسل کے ساتھ
انسانی معراجِ فکر تک پہنچایا ہے۔ فکرِ اقبال کی اساس میں یہ
آیتِ کریمہ اور اس کے ماخذ یعنی قرآن کا پہلو سب سے زیادہ

نمایاں ہے۔ مسلم مفکرین اور دانش وروں میں مولانا رومیؒ کے بعد شاید اقبالؔ ہی دوسرے صاحبِ فکر و نظر ہیں، جنھوں نے صحفِ سماوی کی آخری برگزیدہ کتاب کے اثر و نفوذ کو فکر و فن کے پیکر میں سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فلسفہ و شعر کے جلو میں بنی نوع انسان کی عظیم تہذیب کا سوز و گداز موجود ہے۔ اقبال کو صرف برِ صغیر کی ثقافت کا معیار و منہاج قرار نہیں دے سکتے۔ بلکہ وہ بنی نوعِ انسان کی تہذیب کا ایک جز بن چکے ہیں۔ مشرقی ادبیات میں یہ فخر صرف اقبال کو حاصل ہے کہ وہ عالم گیر تہذیبِ انسانی کے جوہر کی حیثیت رکھتے ہیں اور برِ صغیر کے مسلم دانش وروں کے قلب و نظر پر سب سے زیادہ اثر اقبال کا ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری شہرت اور اثر آفرینی کا دوامی انحصار ان کے انفرادی اسلوبِ فکر پر ہے۔ یہ اسلوبِ فکر مشرق و مغرب، جدید و قدیم کے کئی سر چشموں سے مستفیض ہے۔ اس فکری اجتماع میں استفادہ و انحراف اور ارتباط کا پہلو شامل ہے۔ اس اسلوبِ فکر کے نتیجہ خیز مطالعہ کے لیے ماخذ کی نشان دہی کے ساتھ ارتقائی صورتِ حال کا جائزہ ضروری ہے۔

فکرِ اقبال کی اساس کائنات کے ارتقائی نظام پر مبنی ہے۔ وہ اسی زاویۂ نظر سے سلسلۂ فکرِ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک فلسفہ ایک محرک شے ہے اور حقائق کو تصور کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ اقبال کا فکر ہمیشہ ارتقا

پذیر رہا۔ اس عمل میں نشیب و فراز کے ساتھ استفہام و استفسا کی مختلف منزلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ اقبال کے ذہنی پس منظر کی باز آفرینی میں ان کا تجسّس و تفکر اور تنقید و تبصرہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ استفہامی اندازِ نظر شاعری کے ابتدائی دور ہے شروع ہوتا ہے اور پایانِ عمر تک باقی رہا۔ اور اسی سبب سے ان کا نظامِ فکر بہتر سے بہتر صورت پذیری میں مصروف رہا۔ میرا خیال ہے کہ اگر انہیں کچھ اور مہلت اور فراغت ملی ہوتی تو ان کے فکری تصورات اور بھی زیادہ منظم اور مربوط صورت میں سامنے آتے۔

اس ارتقائی اسلوبِ فکر کی ذہنی واردات پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ حب الوطنی سے آفاقیت تک اور خودی سے بے خودی تک کے عمل میں یہی ارتقائی اسلوبِ فکر کار فرما ہے۔ اس عمل میں صبح کا صحیح شام کو غلط ہو جانا حیرت خیز نہیں۔ اور نہ اس سے استعجاب و انکار لازم آتا ہے۔ اگر اس بنیادی نکتہ پر نظر رکھیں تو ناقدینِ اقبال کے بہت سے اشکالات رفع ہو جاتے ہیں۔ وہ اشکالات جنھیں تضاد و تناقض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس ارتقائی صورتِ حال کی وجہ سے خیالات میں تبدیلیاں ہوئیں۔ کہیں دست بردار اور کہیں رجوع کرنا پڑا۔ اقبال کی فکری سرگزشت کا یہ پہلو نہایت قابلِ غور ہے جسے اقبال نے بھی بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ خطوط میں اکثر و بیشتر اظہار کیا ہے کہ وہ اپنی فکری سرگزشت کی دل چسپ

روداد قلم بند کرنا چاہتے تھے۔ مگر افسوس کہ انجام نہ پا سکا۔

سوانح اور مکاتیب نیز اس ڈائری سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مطالعۂ فکر میں ہمیشہ مصروف رہے۔ ذی فکر اور اہلِ نظر سے استفادہ کرنے کے لئے کوشاں رہتے۔ یہ ضرور ہے کہ معاصر علماء و فضلا میں کوئی ان کی رہ نمائی نہ کر سکا۔ اقبال اپنے اور دیگر مفکرین کی آرا پر تنقیدی نظر ڈالتے رہتے۔ کبھی کوئی بات پسند آئی قبول کر لیا۔ مگر حقیقتِ حال سے واقفیت کے بعد اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کا اسلوبِ فکر متحرک اور آگے کی طرف رواں دواں ہے اور یہی انسانی سرچشمۂ فکر کی تقویم کا اصل الاصول بھی ہے۔ فکرِ انسانی کی یافت کو دیکھئے۔ اس کے جلو میں کتنے اور کیسے نشیب و فراز، اثبات و انکار، انحطاط و انکار کی عبرت انگیز کہانیاں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کا مفکر، خواہ وہ کسی بھی خانوادۂ فکر کا نمائندہ ہو، ماضی کے افکار اور ان کے جہانِ معنیٰ سے سرسری نہیں گزرا۔ وہ ماضی کی یافت اور انتہا کا سہارا لے کر اپنے ذہنی سفر کا آغاز کرتا ہے، اور اسی طرح نوعِ بشر کا ذہنی ارتقاع ہوتا رہتا ہے۔ ہر مفکر اپنے عہد تک کی پیدا شدہ فکری روایات کی بنیاد پر اور ممکنات کا جائزہ لیتے ہوئے تصورات کی دنیا تخلیق کرتا ہے۔ یا بہ صورتِ دیگر تضاد و تخالف، اثبات و انکار میں ربط و ہم آہنگی کو استوار کرتا ہے۔

فکرِ انسانی کے ارتباط و امتزاج سے ایجاد و اختراع

کا عنصر فکرِ اقبال کی اساس کا دوسرا پہلو ہے۔ اُن کا نظامِ فکر جدید و قدیم، مشرق و مغرب کے مکتبہ ہائے فکر کا ایک دل نشیں مرکب ہے۔ اور یہ حسنِ امتزاج محض اتفاق کا نام نہیں ہے بلکہ برسوں کی ریاضت، جگر سوزی اور خونِ دل کی کشید سے پیدا ہوا ہے۔ یہ امتزاج مطالعۂ اقبال میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس امتزاج کی گہری پرچھائیاں اس ڈائری میں بھی مل جاتی ہیں۔ کہیں محمدؐ، عیسیٰ مسیحؑ اور گوتم بدھ کی صورت میں تو کہیں رومیؔ، بیدلؔ، غالبؔ، دانتےؔ، ملٹنؔ، ورڈس ورتھ کی شکل میں۔

اخذ و استنباط کے پس منظر میں اقبال کا ذہنی رویہ یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی کُل پر توجہ نہیں دیتے بلکہ جزئیات کے انتخاب میں کُل کے مجموعی تاثر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جس سے پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ قاری کے پیشِ نظر کُل کا مجموعی تاثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام قاری تخمین و ظن سے دوچار ہوتا ہے۔ مطالعۂ اقبال کے وقت اس نکتہ کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اس پس منظر کے بعد فکرِ اقبال کو حرفِ آخر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال شعر کو الہام کا درجہ ضرور دیتے ہیں۔ مگر ہم ان کے اشعار و افکار کو الہام سمجھ کر نہیں، بلکہ سلسلۂ فکرِ انسانی کی ایک کڑی مان کر نقد و انتقاد کے میزان پر پرکھتے ہیں۔ خود اقبال بھی اپنے قاری سے اسی اندازِ نظر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ فکرِ اقبال کے مرتب و مفید اور منظم و مربوط مطالعے کے لئے

ان کی تمام تخلیقات کے لئے یکساں نظر درکار ہے۔ اس لئے اُن کی اس یادداشت کی بڑی اہمیت ہے۔

اقبال کی ہر تحریر یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن بعض ناقدین نے صرف منظومات کے مطالعے پر اکتفا کرنے کا مشورہ دے کر مغالطہ پیدا کیا ہے۔ آج فکرِ اقبال کی اساس کو استوار کرنے کے لئے ان تمام گم شدہ کڑیوں کو مربوط کرنے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔ اس لئے منظومات کے ساتھ نثری تحریروں کا مطالعہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ اقبال صرف شاعر ہی تو نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت ایک مفکر کی بھی ہے۔ جو شاعری کے درجہ سے کہیں زیادہ ارفع و ارجمند ہے۔ ان کے فن کی ندرت کو سمجھنے کے لئے ان کے اشعار کی ضرورت پیش آئے گی اور صرف مجموعہ ہائے اشعار پر قناعت کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ فنی تجزیے کے وقت ان کے افکار کا ذکر ناگزیر ہوگا۔ اور اسلوبِ فکر کے جائزے کے وقت صرف منظومات پر بھروسہ کرلینا ایک عبرت ناک مغالطہ ہوگا۔

تاریخی ترتیب کے اعتبار سے اقبال کی یہ دوسری کتاب ہے۔ اور ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ نفسِ مضمون و ندرتِ فکر کے اعتبار سے دوسری تصانیف سے کم اہم نہیں سلسلۂ فکرِ اقبال کی اہم کڑی ہے۔ اس دور کے تشکیلی ذہن کو سمجھنے کے مواد و مواقع کم سے کم ہیں۔ ایسی صورت میں اس کتاب سے بڑی مدد لی جاسکتی ہے۔ اقبال کی فکری تشکیل میں یہ

دور خاصا اہم ہے ۔ اقبال کے افکار کا ابتدائی دور ۱۹۰۵ء میں ختم ہو جاتا ہے ۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یورپ میں تین سال قیام کے نتائج بہت ہی معنی خیز ہیں ۔ پچھلے تصورات میں پختگی، ارتقا، اور انحراف کے ساتھ نئے افکار بھی ذہنِ اقبال میں جگہ پلتے ہیں۔ اقبال نئے مشاہدات و تصورات لے کر وطن واپس آتے ہیں ۔ اس ڈائری میں جابجا انھیں مشاہدات و تصورات کے عکس ملتے ہیں۔ ابتدائی فکری روایات کو آگے کی طرف رواں دواں بڑھنے کا معنی خیز ثبوت اس یادداشت میں واضح طور پر موجود ہے ۔

"علم الاقتصاد" اقبال کی پہلی کتاب ہے جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی ۔ علمِ معاشیات پر اردو میں یہ پہلی تصنیف ہے ۔ اس کتاب کے مباحث و موضوعات اگرچہ معاشیات کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہیں لیکن کتاب میں جگہ جگہ اقبال کے اندر موجود بنی نوع انسان سے جذبۂ ہمدردی کا والہانہ اظہار ملتا ہے ۔ معاشرۂ انسانی کے حیات آفریں پہلوؤں کی تکمیل کے لئے اقبال نے بصیرت افروز نظر ڈالی ہے ۔ یہ صرف "علم الاقتصاد" نہیں ہے ۔ بلکہ انسانی سماج کے مسائل کی فکر انگیز داستان ہے ۔ یہ علمِ معاشیات پر کوئی تحقیقی یا معیاری کتاب نہیں، بلکہ ایک مبتدی مفکر کی ابتدائی کوشش ہے ۔

۱۹۰۵ء یعنی یورپ جانے سے پیشتر اقبال کے فکر و نظر کی بساط میں چند تصورات تشکیل پا رہے تھے ۔ اور ان کی جڑیں گہری ہو رہی تھیں ۔ ان میں قومی تہذیب و اصلاح ، اقتصادیات و عمرانیات، استفہام و استفسار ، شاعری و پیغمبری ، فرد و جماعت ، موت و حیات ، وحدت الوجود ، حب الوطن ، عقل و دل ، حسن و عشق ، عرفانِ نفس ، کوششِ پیہم ، عظمتِ انسانیت ، تسخیرِ کائنات ، امامت و

سیاست، تعلیم و ترقی، مظاہرِ فطرت سے گہری وابستگی وغیرہ موضوعات خاص اہم ہیں۔ یہ فکروفن کا ابتدائی دور ہے۔ اسی لئے یہ تصورات بھی ابتدائی ہیں۔ ان میں پختگی کی تلاش زیادہ مفید نہیں۔ یہ نقش اول بھی ہے۔ یہ خیالات منتشر، غیر مربوط اور عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان سے ایک خوش آئند مستقبل کا پتہ لگتا ہے۔

اقبال یہی بساطِ فکر لے کر یوروپ گئے۔ وہاں کے مطالعہ و مشاہدہ نے بعض تصورات میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان میں قومیت، تصوف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یورپ سے واپسی پر ان تبدیلیوں کا برملا اظہار بھی ہونے لگا۔ انھوں نے علاقائی یا جغرافیائی نظریۂ قومیت کو مذہب کا کفن اور بنی نوعِ انسان کے ہیئت اجتماعی کو پارہ پارہ کرنے والا، مغرب کا افسانہ و افسوں قرار دیا۔ "بانگ درا" کے حصہ سوم کی نظم "وطنیت" (بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے) میں ان کی تنقید اور لب و لہجہ سخت ہے۔ عالمی انسانی برادری کو مختلف علاقائی خانوں میں تقسیم کرنے اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے دست وگریباں ہونے میں اس مغربی نظریۂ قومیت کے خلاف اقبال کی بغاوت اسی دور سے شروع ہوتی ہے۔ اس یادداشت کا ایک اہم موضوع یہی علاقائی نظریۂ قومیت ہے۔ جسے مختلف عنوانات سے بیان کیا گیا ہے۔ اور دنیا کے مختلف عقائد و افکار کے پس منظر میں اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مختلف قوموں کی تہذیبی، اخلاقی، مذہبی و سیاسی، تاریخی و فکری اقدار پر جابجا اظہارِ خیال ملتا ہے۔ اور ان اقدار سے مرتب ہونے

والے شعور و کردار پر اقبال نے گفتگو کی ہے۔ مسلمان، ہندو، جرمن، انگریز، یہودی وغیرہ اقوام پر گفتگو کے زاویے مختلف ہیں مگر اقدار کی تلاش اور ان کی قدر و قیمت کا تعین سب میں مشترک ہے۔ اس یادداشت میں، قوم، ملت، مذہب کا احساس بھرپور شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ جس سے اقبال کے ذہنی اضطراب و ارتقا کا پتہ لگتا ہے۔ وہ مسلم قوم کے اعمال و افکار پر بہ طورِ خاص متوجہ ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اقبال ذہنی سفر کے کسی دور میں بھی اس موضوع سے غافل نہیں رہے اور نہ ہی ہندوستان کے مسائل سے کبھی چشم پوشی کی۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ مسائل سے ان کی دلچسپی جذباتی حد تک بڑھ گئی گئی۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی گہری وابستگی کی وجہ سے وہ قومی عقیدہ و تہذیب، ماضی و حال، عروج و زوال کے اسباب پر گہری اور فکر انگیز نظر کے ساتھ متوجہ ہیں۔ اس نوٹ بک میں اس طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ اسی تعلق سے وہ اسلام، عیسائیت اور بدھ مذہب وغیرہ کے تقابلی مطالعے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اس مطالعے سے برآمد ہوتے والے نتائج کا اکثر و بیشتر ذکر ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈائری میں کئی جگہ حضرت محمدؐ، حضرت عیسیٰ مسیح اور گوتم بدھ کا فکر انگیز تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان برگزیدہ ہستیوں کے آئین و آثار، معاشرۂ انسانی پر مرتب ہونے والے اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈائری کا یہ تقابلی مطالعہ خاصا اہم ہے۔ اور ذہنِ اقبال میں اس دور میں

تشکیل پانے والے تصورات پر ایک نتیجہ خیز ماخذ کی طرف اشارہ بھی ہے۔ کیوں کہ چند ہی سال بعد خودی کا مہتم بالشان فلسفہ وجود میں آیا۔ فلسفۂ خودی کے اظہار سے پہلے کے ماخذ و محرکات کی صحیح نشان دہی ابھی تک نہیں کی جا سکی ہے۔ اس لئے اس یادداشت کے مندرجات کی بڑی اہمیت ہے۔

اقبال کو شروع سے ہی اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے گہری دل چسپی رہی ہے۔ اس شغف میں عقیدہ و ایمان کے ساتھ عروج و زوال کے اسباب پر غور و فکر بھی شامل ہے۔ اقبال اسلام کو دنیائے انسانی کے لئے سب سے اعلیٰ و ارفع دستورِ حیات تسلیم کرتے رہے ہیں۔ وہ اسلام کو صرف ایک مذہب نہیں سمجھتے، بلکہ ایک انقلاب انگیز فلسفۂ زندگی مانتے ہیں۔ یہ انقلاب انگیزی فرد کے داخلی کوائف اور خارجی مظاہر دونوں میں حیات بخش تبدیلی کی متقاضی ہے۔ اقبال نے اس پسندیدہ موضوع کو فکر و نظر کے ساتھ تحلیل کیا ہے۔ اور اپنے فن میں جذب کر کے ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے۔ اسلام سے ان کا تعلق صرف جذباتی نہیں ہے بلکہ فکر و نظر کے عمیق مطالعۂ فکر کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس یادداشت میں اکثر و بیشتر اس حقیقت کا اعتراف ملتا ہے۔ انھوں نے توحید و رسالت پر اسی فکر انگیزی سے کام لیا ہے۔ اس ڈائری میں محمدؐ کی ذات اور ان کے ارشادات کو فکر و فلسفہ کے معیار و منہاج پر پیش کیا گیا ہے۔ اقبال نے ان کی شخصیت اور سیرت کو انسانیت کا مکمل ترین تصور بنایا ہے۔ اور ان کے ارشادات کو فکر انسانی کی

معراج قرار دیا ہے۔ اسی نسبت سے دنیا کی چند لازوال ہستیوں کے بارے میں بھی فکر انگیز خیالات ملتے ہیں۔ دنیا کے چند انقلاب آفریں اقوام اور ان کے عقائد و افکار کا ذکر بھی اقبال نے اسی تقابل میں پیش کیا ہے اور اسی تعلق سے مختلف قوموں کی فکر و تاریخ اور انسانی معاشرت پر ان کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان اقوام کے مختلف عصری رجحانات اور ان کے فکر ساز مفکرین کے افکار و آرا پر بھی اقبال نے بصیرت افروز اظہارِ خیال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے تمام مندرجات سے بہ قول جاوید اقبال اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ان کے بیشتر تصورات حقائق کے گہرے ادراک پر مبنی ہیں اور ان سے اتفاق کے سوا قاری کو مفر نہیں۔

اس شذرات میں بہت سے مفکرین کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے اقبال کے انہماک اور فکری ماخذ و مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ کئی جگہ افلاطون، ارسطو، ہیگل، کانٹ، اسپنوزا، نطشے وغیرہ کے افکار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس تذکرے سے ان کے ذہن کی سمت و رفتار متعین کیا جاسکتی ہے۔ اور مستقبل میں مربوط شکل میں ظاہر ہونے والے فلسفہ و فکر کے اصل سرچشموں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

اقبال کچھ ہی سال پہلے یورپ سے واپس آئے ہیں۔ اس کتاب میں یوروپ اور جرمنی کا بطورِ خاص ذکر ملتا ہے۔ اقبال کا ہر طالبِ علم جانتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر مشہور جرمن فلسفی نطشے سے کافی قریب ہیں۔ اس مجموعۂ شذرات کے مطالعے سے ایک

اہم نکتہ سامنے آتا ہے کہ اقبال نے اس تصنیف میں پہلی بار نتشے اور اس کے افکار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے پہلے کہیں فکر نہیں ملتا۔ ہاں عطیہ فیضی نے اپنی ڈائری (خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی) میں لکھا ہے کہ اقبال جرمنی میں قیام کے دوران نتشے کے فلسفیانہ افکار پر گفتگو کرتے نظر آتے تھے۔ گویا اقبال اس دور تک نتشے سے متعارف ہو چکے ہیں۔ اس ڈائری میں قوت کی ضرورت و اہمیت پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جس سے ذہنِ اقبال کے محور و مزاج کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ خودی، انسانِ کامل، سعیِ پیہم اور حصولِ قوت سے مربوط ہونے والے فلسفے کے رشتہ و پیوند کو اس ابتدائی فکری پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خدا طاقت ہے (۶۳)، طاقت ور انسان (۶۴)، لمسِ طاقت (۶۵)، طاقت ور انسان کے افکار (۶۶)، وغیرہ عنوانات کی فکری تہ داری کو اسی سیاق و سباق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اس دور کے اقبال کو سمجھنے کے لئے چار ماخذ ہیں۔

ان کی سوانحِ عمری، جس میں یورپ سے واپسی کے بعد مناسب تلاشِ روزگار، اور نجی زندگی کی ناآسودگی سے ذہنِ اقبال میں ایک کرب کا رجحان ملتا ہے۔ نان و نفقے کے لئے کالج اور عدالت کی خاک چھان رہے ہیں۔ وکالت کے مقابلے میں تعلیم و تعلم کے پیشے کو یقیناً بہتر سمجھتے ہیں۔ قومی اور ملی مسائل سے دوچار معاشرہ کی طرف بھی نظر ہے۔ دوسرا ماخذ شاعری ہے۔ اس دور کی شاعری کا حاوی رجحان حُسن و عشق ہے جس کے مختلف

روپ ہیں - ارضی بھی اور ماورائی بھی - حسن قدیم یا حسنِ ازل کا ابتدائی
تصور اس دور میں مختلف تصورات کی آمیزش سے ایک مرکب
بن گیا ہے - پیغام و اصلاح کے رجحانات بھی زندگی کی بعض گہری
سچائیوں کے ساتھ ہم دوش ہیں - تیسرا ماخذ ان کے خطوط ہیں
خاص طور پر بیگم عطیہ فیضی کو لکھے گئے خطوط، جن میں ذہن
اقبال کی ایک انتہائی دردناک داستان پوشیدہ ہے - وہ نجی زندگی
کے تاریک پہلوؤں، سماجی حالات، خوش حال زندگی کی محرومی، ملکی و
ملّی مسائل کی پیچیدگی، معاش و معیشت کی بے اطمینانی سے بے
چین ہو کر اقبال ملک سے فرار یا شراب نوشی میں پناہ لینا چاہتے
ہیں اور تمام سماجی و روایاتی بندشوں سے خود کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔
ان خطوط سے اقبال کی شخصیت اور فکر کی حیرت انگیز اور عبرت ناک تصویر
ابھرتی ہے۔ لیکن چوتھے ماخذ سے برآمد ہونے والے اقبال کی شخصیت و
سیرت اور فکر و ذہن بالکل مختلف ہیں - یہ خود نوشت بہت ہی مختصر
دور کی فکری سرگزشت ہے - لیکن اس اختصار کے باوجود ہمیں ایک
بالغ نظر اور عبقری ذہن کا علم ہوتا ہے - ہم صالح و صحت مند، سلجھے
ہوئے، اثباتی نقطۂ نظر رکھنے والے اقبال سے متعارف ہوتے ہیں۔
ان ماخذ کے پس منظر میں اس یادداشت کی افادیت سے چشم پوشی
نہیں کی جاسکتی - کیوں کہ فکرِ اقبال کے ارتقائی اسلوب کی اصل
تصویر اسی میں ملتی ہے اور "فلسفۂ اسرار و رموز" کے موجد یا مخترع
کی دل نشیں تصویر اسی یادداشت کے بکھرے خیالات میں تلاش کی
جاسکتی ہے - خودی کے ارکان، اس کی غیر مرئی تصویریں، حصولِ

خودی کے لئے پیہم جدوجہد کا پیغام، خودی کا زندہ پیکر، عظیم انسان کی تلاش اور دوسرے پہلو اس نوٹ بک میں سایہ نشین ہیں۔ فرد کی رعایت سے سماج کے کوائف، اعلام وارکان پر بھی اقبال نے سنجیدہ نظر ڈالی ہے۔ خودی، بے خودی، جذبۂ عشق سے سرشار اور بے پناہ قوت کا حامل انسان کا خاکہ بھی اس میں موج تہ نشیں کی صورت میں موجود ہے۔

اس یادداشت میں اقبال کی نجی زندگی کے ذاتی خط و خال بھی نمایاں ہیں اور ان کے فکر و شعور کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اس ڈائری میں ایک ایسا مقام بھی ہے جو انتہائی حیرت خیز ہے۔ اقبال نمبر شمار چھتیس (۳۶) میں ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈس ورتھ کے تحت یہ انکشاف کرتے ہیں کہ وہ دہریت اور تشکیک کے دور سے گزر چکے ہیں۔ اور ورڈس ورتھ نے انھیں دہریت سے بچایا۔ جاوید اقبال نے اس دہریت کی وضاحت کی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اقبال کی اس دہریت سے مراد مادیت پرستی ہے۔ انکارِ خدا نہیں۔ بہ ہر حال اقبال کے پورے سرمایۂ ادب میں یہ پہلا اشارہ یا انکشاف ہے جو اقبال کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ ڈائری میں نجی زندگی کی ایک دوسری جھلک بھی قابلِ ذکر ہے۔ نمبر شمار ایک سو دس (۱۱۰) "شاعر بہ حیثیت انسان" میں اقبال نے اپنی گھریلو زندگی کا ایک خوب صورت مرقع پیش کیا ہے۔ اس تحریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فکرِ اقبال کی بے عملی پر اسی وقت سے اعتراض شروع ہو چکا تھا۔ وہ گھر کی چہار دیواری کے اندر بچوں کو اپنے کاندھوں پر بٹھلاتے، ان

کے ساتھ کھیلتے اور ان کا دل بہلاتے نظر آتے ہیں ۔ بوڑھی ماں کے ہاتھوں کا لمس اور پیار اُن کے اندر ایک شباب آفریں زندگی بخشتا ہے۔ یہاں وہ صرف خواب دیکھنے والا مثالیت پسند فلسفی کے روپ میں نہیں بلکہ ایک حقیقی انسان نظر آتے ہیں ۔ اور اقبال نے یہیں فکر و نظر پر کیے گئے اعتراضات کا جواز بھی پیش کیا ہے ۔ بکھرے تصورات کی اس مختصر تصنیف کا ایک خاص اہم موضوع فنِ شعر اور اس کی غرض و غایت ہے ۔ یہ مضمون بوقلمونی، کثرت آرائی ، اور تنوع کے اعتبار سے ڈائری کا سب سے زیادہ اہم عنوان ہے ۔ مشرق و مغرب کے فنِ شعر، نقد و انتقاد اور فن کاروں کے بارے میں اقبال کی گہری تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعری اور منطقی صداقت، زندگی بہ حیثیت تنقیدِ شاعری ، نظم کی مقبولیت ،عرب شاعری، شاعر اور روحِ عالم ، شاعر اور سیاست داں ، ماہرِ نفسیات اور شاعر، شاعر بہ حیثیت انسان ، فلسفہ اور شاعری کا اثر، فن ہی غیر محدود ہے ، ادبی تنقید ، وغیرہ موضوعات کی کثرت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ اور فن کاروں میں رومی ، بیدل ، ورڈس ورتھ ، حافظ ، گوئٹے ، ہائنے ، شکسپیر، ملٹن ، اوسکر وائلڈ، ہورلیس ، ہانٹین ، غالب ، آزاد کے فنی حسن اور فکری رجحانات کا تجزیہ ملتا ہے ۔

یہ ڈائری فن کے موضوع سے شروع ہوتی ہے ۔ اس موضوع سے متعلق اقبال کی پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ فن انسانی تخلیق کا پاکیزہ ذریعۂ اظہار ہے ۔ اِس کا درجہ مقدس و

محترم ہے۔ اس کے اعلیٰ ترین مقاصد ہیں۔ یہ جزوِ پیغمبری ہے۔ صرف سامانِ تفریح یا ذریعۂ انبساط نہیں۔ یہ زندگی کے گوناگوں حقائق کی ترجمانی اور مقاصد آفرینی سے عبارت ہے۔ اور معاشرہ کی فکری توانائی اس کے جذبہ و احساس اور تہذیبی اقدار کے لطیف ترین تصورات کو جمالیاتی پیکر میں ڈھالنا اس کا دوسرا مقصد ہے۔ اس مختصر گفتگو میں اقبال کے نظریۂ فن کی ترقی یافتہ صورت بھی ہمیں ان "بکھرے خیالات" میں مل جاتی ہے۔ جس کی آخری صورت گری کی طرف اقبال نے "بالِ جبریل" میں معنی خیز اشارہ کیا ہے:

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

"بکھرے خیالات" کے مطالعے سے اقبال کے ادبی نصب العین کے ساتھ ان کے مطالعے کی وسعت اور متنوع پہلوؤں کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور جرمن ادبیات کے نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ گوئٹے کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ اقبال نے عربی ادب کا خاصا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کلام میں جا بجا اظہار ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کی شاعری کے آہنگ کی ساخت میں عربی لے کی آمیزش نے اُسے پرشکوہ و پُر وقار بنا دیا ہے۔ اقبال نے حماسہ کے حوالے سے عربی شاعری (۵۶) کے بنیادی کردار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبال نے حماسہ کے علاوہ اور کوئی حوالہ

نہیں دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب الحماسہ کے باب الحماسہ کے تینتالیسویں شعر کی طرف اشارہ ہے۔

قال محمدؐ بن عبد اللہ الازدی

لا اَدفع ابنَ العمّ یمشی علی شفا
وان بلغنی من اذاہ الجنادع

باقی دوسرے اشعار سے نفسِ مفہوم نہیں ملتا۔ اگرچہ اس شعر کا بھی ہو بہو وہ مطلب نہیں جسے اقبال نے نقل کیا ہے۔
ذہنِ اقبال اس دور میں مختلف موضوعات کے تقابل کی طرف خاص طور پر متوجہ ہے۔ مذاہب، فکرساز شخصیتیں، ادبیات، ممالک، مختلف طرز ہائے حکومت، قومی، تاریخی وغیرہ موضوعات کا بلیغ اور نتیجہ خیز موازنہ پیش کیا گیا ہے۔

اس ڈائری میں اقبال کا ذہنی رویّہ فکری زیادہ معلوم ہوتا ہے، جذباتی کم۔ جب کہ اس دور میں لکھے گئے خطوط اور شاعری میں جذبے کا رجحان غالب ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے ہاں تفکر کا پہلو شروع ہو چکا ہے۔ وہ انفس و آفاق کے مختلف النوع مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر میں منہمک ہیں۔ اور اس انہماک سے حاصل ہونے والے نتائج کا عکس ڈائری میں موجود ہے۔ بعض خیالات بہت واضح اور روشن نہیں ہیں۔ وہ ابھی غور و فکر کی منزل میں دکھائی دیتے ہیں۔
اس یادداشت میں اقبال کا طریق اظہار بیشتر جگہ قطعی اور دو ٹوک ہے۔ افکار کے اس ہجوم میں دو ٹوک اظہار سے پتہ چلتا ہے

کہ ذہنِ اقبال میں یہ تصورات آئینہ کی طرح صاف اور واضح ہیں۔ ابہام و اغراق اگرچہ اقبال کو شاعری کے لئے پسند ہیں۔ مگر تصورات کے اظہار میں ابہام محسوس نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ اقبال کا طریقِ فکر ہے۔ انگریزی زبان کی وجہ سے بھی اقبال کو بھی بہت سی سہولتیں میسر ہیں۔ ان فکر انگیز خیالات کا اظہار گہری بصیرت کے ساتھ پر زور لب و لہجہ میں ہوا ہے۔ شاید اس وقت تک اردو میں اقبال کے لئے اظہار زیادہ مشکل تھا۔ یوں بھی اقبال نے فلسفیانہ خطبات انگریزی میں ہی پیش کئے ہیں۔

اس یادداشت میں ایک دو مقامات پہ اقبال نے نثری پیرایۂ اظہار میں شعر کے حسن و لطافت کو سمونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جیسے "ادائے شکر (۱۰۵)، انسان اور لامتناہیت (۱۰۹)۔ فکرِ اقبال کے سیاق و سباق میں ان بکھرے خیالات کی گوناگوں اہمیت کے پس منظر میں ہم ان کے فکری ارتقا، اس دور کے تصورات اور ان کے ماخذ سے بہ خوبی متعارف ہوتے ہیں۔ مستقبل کے فلسفی اقبال کے بارے میں ایک واضح تصور قائم کرنے میں حق بہ جانب ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ فکری ارتعاشات صرف چند ماہ میں قلم بند کئے گئے۔ مگر ان کا سلسلہ "اسرار و رموز" کے علاوہ اقبال کے دوسرے تصورات سے قائم کیا جاسکتا ہے اور ان کے سہارے ذہنِ اقبال کی فکری سرگزشت مرتب کی جاسکتی ہے۔ میں نے

۱۹۶۹ء میں "اقبال کے ابتدائی افکار" کا تجزیہ کتابی صورت میں پیش کیا تھا۔ جو ۱۹۰۵ء تک کے تصورات پر مبنی ہے۔ فکرِ اقبال کے جائزے کی دوسری کڑی ہے۔ جسے ترجمے کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ مجھے اس ترجمے میں کتنے دشوار گزار اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ یہ وہی حضرات محسوس کر سکتے ہیں۔ جنھیں ترجمے سے سابقہ پڑا ہو۔ فلسفیانہ خیالات خاص طور پر اقبال کے افکار کا ترجمہ تو اور بھی دقت طلب ہے۔ فکرِ اقبال کا سب سے اچھا ترجمہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" ہے۔ جسے سید نذیر نیازی نے انجام دیا ہے۔ سید نذیر نیازی کو یہ آسانی میسر تھی کہ انھوں نے خطبات کا ترجمہ اقبال کو دکھایا اور ان سے مفید مشورے بھی حاصل کئے۔ خود مصنف نے اصلاحات بھی کیں۔ میرے لئے کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ لغت یا اپنے بزرگوں اور دوستوں کا سہارا لوں۔ محترم المقام پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے انتہائی شفقت فرمائی۔ انھوں نے اردو کے دوسرے بڑے فن کار مرزا غالب کی ڈائری "دستنبو" کا انتہائی دل کش انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ میں ان کے تجربات سے استفادے کو اپنے لئے باعثِ اعزاز سمجھتا ہوں۔ استاذی پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن کو انگریزی پر جو عبور حاصل ہے۔ وہ قابلِ رشک ہے۔ ترجمہ پر انھیں خاص مہارت ہے۔ اس ترجمہ کے دوران قدم قدم

پر روزانہ کے مخلصانہ مشوروں کے لئے میں ان کا ممنونِ کرم ہوں۔
میرے مخلص دوست سیّد غلام سمنانی صاحب کو انگریزی، فارسی اور اردو ادبیات کے علاوہ اقبال پر جو بصیرت حاصل ہے وہ اس نسل کے کسی دوسرے استاذ کے یہاں دکھائی نہیں دیتی۔ انھوں نے اپنے مطالعے اور بصیرت سے بھرپور استفادے کا موقع دیا۔

میں نے ترجمہ کرتے وقت کسی خاص اصول یا نقطۂ نظر کو نہیں اپنایا۔ بلکہ لفظی ترجمے پر اکتفا کیا۔ تاکہ اقبال کے صحیح تصورات کو عام فہم زبان میں منتقل کر سکوں۔ اسی لئے تخلیق و ترجمہ کا فرق برقرار ہے۔ میں نے ربطِ عبارت کی جگہ ربطِ خیال کو اہمیت دی ہے۔ ترجمہ کو شعر کی زبان سے حتی الامکان دور رکھا ہے۔

ترجمہ پریس میں تھا کہ یہ اطلاع ملی، کہ پاکستان میں "شذراتِ اقبال" کے نام سے اس ڈائری کا ترجمہ شائع کیا ہو چکا ہے۔ چوں کہ مطبوعہ ترجمہ ہندوستان میں دستیاب نہیں ہے۔ اس لئے یہ ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ورنہ ایک ترجمہ کے بعد دوسرے ترجمہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

شعبے کے احباب ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، اور ڈاکٹر فضل الحق نے اس ترجمے کی اشاعت کے لئے ہر ممکن تعاون سے نوازا۔ محمود قمر، شفیق احمد، محمد

غیاث الدین اور امتیاز حسین جیسے عزیز دوستوں کی رفاقت نے
بہت سے مشکل مرحلوں کو آسان بنا دیا۔ چچی صاحبہ، بہنوں، بھانجیوں،
اور مسعود احمد کی بے پایاں شفقت و محبت کے لئے سراپا سپاس
ہوں کہ ان لوگوں نے والدین کی خدمت اور خبرگیری کی ذمہ داری
اپنے اوپر لے کر میرے لئے سہولتیں فراہم کیں۔

عبدالحق
شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی دہلی

یکم مارچ ۱۹۷۵ء

تعارف

یہ یادداشت (نوٹ بک) محمد اقبال کے کاغذات میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نوٹ بک کے مطابق اقبال نے اُسے ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء سے لکھنا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے کئی مہینے لکھتے رہے۔ اور پھر کچھ نامعلوم سبب سے رک گئے۔ شاعر نے خود اس نوٹ بک کا نام "بکھرے خیالات" رکھا ہے۔ اس میں عجیب وغریب تحریریں، ان کتابوں کے تاثرات پر مبنی ہیں جن کا اس زمانہ میں وہ مطالعہ کر رہے تھے اس میں جس ماحول میں وہ سانس لے رہے تھے اس کے متعلق ان کے خیالات واحساسات اور طالب علمی کے زمانے کی یادداشتیں ہیں۔

اگرچہ ہم ان کے کچھ خیالات سے اتفاق نہیں کرسکتے پھر بھی یہ نوٹ بک ہمیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ ہم ذہنِ اقبال کی بیداری، گہرائی اور زرخیزی دیکھ سکیں۔ ہم ان کی ہمہ جہت دلچسپیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور وسیع النوع موضوعات جیسے فن، فلسفہ، ادب، سائنس، سیاست اور مذہب کے متعلق

ان کے افکار و آرا پر مطلع ہوتے ہیں ۔ وہ ایک محکوم قوم پر ملوکیت کے نفسیاتی اثرات کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔

اقبال کا طرزِ بیان بہت سادہ ، دو ٹوک اور زور دار ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی ان کا اضطرار حیرت خیز ہوتا ہے ۔ عام طور پر وہ اپنے خیالات چند جملوں یا ایک پیراگراف میں ظاہر کرتے ہیں اور اگرچہ وہ نثر میں لکھ رہے ہیں ۔ لیکن ان کا اسلوبِ نگارش شاعر کے ایجازِ بیان کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ جو چند لفظوں میں ایک جہانِ معنی پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ بہ ظاہر اس نوٹ بک میں مندرج خیالات میں کوئی تسلسل نہیں ہے ۔ کیوں کہ وہ کسی طے شدہ منصوبہ (خاکہ) کے تحت قلم بند نہیں کیے گئے ۔ اس کے باوجود یہ یادداشتیں شاعر اقبال پر ان خیالات اور قوتوں کے فوری اور حساس ردِ عمل کو منعکس کرتی ہیں ، جو اس کو متاثر کر رہے تھے ۔ اور یہ کردارِ اقبال کی پیچیدگی کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں ۔ اقبال ان مفکروں میں سے ہیں جو ہمیں اپنے فکر کے اچھوتے پن اور اخیال انگیزی سے ہمیشہ متحیر کرتے ہیں ۔ اگرچہ ہم میں سے اکثر ان کے بڑے کارناموں سے واقف ہیں پھر بھی یہ فرض کر لینا غلط ہے کہ ہم نے انھیں پوری طرح سمجھ لیا ہے ۔

۱۹۱۰ء میں اقبال کی عمر سنتیس ۳۷ سال کی تھی اور وہ انارکلی بازار کے ایک مکان میں رہتے تھے ۔ وہ ۱۹۰۸ء میں ڈاکٹریٹ کی سند لینے اور بیرسٹر ہونے کے بعد لاہور واپس آ گئے ۔ واپسی پر ان کا نام بہ طور ایڈووکیٹ کے درج کیا گیا اور انھوں نے عدالتِ

قانونی میں وکالت شروع کی ۔ وہ اسی زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے ۔ ڈیڑھ سال کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج کی پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا ۔ کیوں کہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ جب تک سرکاری ملازمت میں رہیں گے آزادی کے ساتھ اظہارِ خیال نہیں کر سکتے ۔

۱۹۰۹ء میں ہندوستان میں مورلے منٹو اصلاحات کا نفاذ ہوا ۔ نئے انڈین کونسل ایکٹ کی رو سے جداگانہ انتخاب کے ذریعہ الکشن کا اصول پیش کیا گیا تھا ۔ اور اس پر بہت ہی محدود طریقے پر عمل درآمد بھی کیا گیا ۔ بہ ظاہر کوئی سیاسی زندگی اس طرح کی نہیں تھی جو ملازمت کے قابلِ قبول مواقع اقبال جیسے انسان کو فراہم کرتی جو برطانوی شہنشاہیت کا مخالف تھا اور جو ہندوستانی برِ صغیر کے عوام کی سیاسی آزادی کے قیام کے لئے سرگرمِ عمل ہونا چاہتا تھا ۔

اقبال شدید مالی دشواریاں کے باوجود انگریزی سرکار کی ملازمت کرنے میں پس و پیش کرتے رہے ۔ حالاں کہ ان کی جیسی صلاحیتیں رکھنے والے آدمی انگریزی راج میں بہت آسانی سے کھپ سکتے تھے ۔ اسی لئے وہ کسی مسلمان حکمراں کی سرپرستی میں کسی طرح کی علمی ملازمت کی اِمکانی تلاش (میں دل چسپی رکھتے تھے) کے خواہاں تھے ۔ تاکہ وہ اپنے خیالات کا بے باکی سے اظہار کر سکیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس یادداشت کے شروع کرنے سے چند ماہ قبل اسی غرض سے وہ ریاستِ

حیدر آباد گئے تھے۔ لیکن وہاں کے لوگوں کی مُردہ دلی (سرد مہری) اور نظام کی انگریزوں سے جی حضوری دیکھ کر انھیں بہت زیادہ بیزاری اور مایوسی ہوئی اور وہ لاہور واپس لوٹ آئے۔

اس دور میں لکھے گئے خطوطِ اقبال بنام عطیہ بیگم سے ایک ایسا انسان اُبھرتا ہے جو اپنے جیسے تخلیقی افراد پر اپنے فرقہ کے معاشرتی رسوم کے جبر کی وجہ سے تلخ اور نا امید ہے۔ خطوطِ اقبال ان کے معاصروں کی ریا کاری، 'تنگ نظری' اور" ہم چوں من دیگرے نیست" کے تصور کے خلاف حقارت آمیز نفرت سے معمور ہیں۔

اقبال نے عطیہ بیگم کو لکھا "میں کسی ملازمت کا خواہاں نہیں۔ میرا ارادہ اس ملک سے جلد سے جلد چلے جانے کا ہے۔ میری زندگی حد سے زیادہ تکلیف دہ ہے بہ حیثیت انسان مجھے بھی خوشی کا حق ہے۔ اگر سماج یا فطرت مجھے خوشی سے محروم رکھتی ہے میں دونوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کا صرف یہی علاج ہے کہ میں اس بد بخت ملک کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دوں، یا شراب نوشی میں پناہ لوں، جو خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے۔ یہ بے جان، ویران کتابوں کے اوراق خوشی نہیں دے سکتے، انھیں اور تمام سماجی روایات کو بھی جلانے کے لئے میری روح میں کافی آگ موجود ہے۔"

(اقبال از عطیہ بیگم ص ۳۶، ۳۷)

ایک دوسرے خط میں وہ پھوٹ پڑے ہیں ۔

"میں ایک سیدھی سادی ایمان دارانہ زندگی بسر
کرتا ہوں ۔ میرا دل مکمل طور پر میری زبان کا
ہم نوا ہے ۔ لوگ ریاکاری کی تکریم اور تحسین
کرتے ہیں ۔ اگر ریاکاری مجھے شہرت، عزت
اور تحسین بخشے تو میں یہ بہتر سمجھوں گا کہ گم نامی
میں مرجاؤں اور میرے لئے کوئی رنجیدہ خاطر
نہ ہو ۔ عوام کا عفریت ہزار سر ان لوگوں کو
اعزاز کا فیصلہ بخشا کرے جو مذہب و اخلاق
کے جھوٹے تصورات پر عمل کرتے ہیں ۔ اور
ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں ۔ میں ان
کی اُن روایات کے احترام کے لئے سر خم
نہیں کر سکتا ۔ جو انسانی ذہن کی فطری آزادی
کو سلب کرتی ہیں ۔"

ایضاً ص ۹۴

وہ اس وقت کبیدہ خاطر تھے کہ اپنے ایک خط مرقومہ ۷ / اپریل
۱۹۱۰ء (اس یادداشت کو شروع کرنے سے چند ہفتے پہلے) میں
عطیہ بیگم کو لکھا ۔

"لیکن میرے اندر اب شاعری کا کوئی ولولہ
نہیں ۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جیسے کسی
نے میری شاعری کی حسین دیوی کو قتل کر دیا ہو ۔

اور میں اپنی تمام قوتِ متخیلہ سے محروم ہو چکا ہوں۔
شاید نظم "اورنگ زیب"، جن کے مقبرے کی
میں نے حال ہی میں زیارت کی ہے؛ میری
آخری نظم ہو۔"

ایضاً ص ۶۸، ۶۹

اگرچہ انجمن حمایتِ اسلام، لاہور کی یہ روایت تھی کہ اس کے سالانہ جلسے میں اقبال سے نظم پڑھنے کی فرمائش کی جاتی۔ لیکن ۱۹۱۰ء میں اقبال نے اس موقع پر کوئی نظم نہیں سنائی۔ انجمن کے اندر بھی پھوٹ تھی۔ جس سے مقدمہ بازی کی نوبت آئی۔ اور اس نے بھی اقبال کو متردّد کیا۔ بہ ہر حال اقبال نے اس زمانے میں چند ہی نظمیں لکھیں جو مقامی میگزین (رسالوں) میں شائع ہوئیں۔ لیکن وہ بہت بلند معیار کی نہیں تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سال کے دوران ان کی تخلیقی فعالیت ان کی اپنی شکستِ طلسمِ خیالی اور گرد و پیش پھیلی ہوئی تہ نشین مایوسی کی وجہ سے معطل رہی۔ ایسا ممکن ہے کہ جب انھوں نے اپنے کو نظم لکھنے کے شایاں نہ محسوس کیا۔ تو اس کے بجائے یادداشتوں کو قلم بند کرنے کی طرف مائل ہوئے۔ اس لئے یہ یادداشت ۱۹۱۰ء کی اہم تصنیف ہے۔

یہ تخلیقی عمل کی اجنبیت کا ایک حصہ ہے کہ زمانۂ خاموشی اور گوشہ نشینی اکثر اپنے پُراسرار مقصد کی تکمیل کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت اقبال کی سطح پر جو سکون تھا۔ اس کے

نیچے یقیناً شور انگیز طوفان انگڑائیاں لیتے رہے ہوں گے۔ آئندہ سال ۱۹۱۱ء میں خدا سے زبردست احتجاج "شکوہ" میں آتش فشاں کی طرح پھوٹ پڑے۔ اس مشہور نظم شکوہ میں زوالِ مسلم پر انھوں نے اپنی شکایت وغصہ کا برملا اظہار کیا۔ اور اپنے غصہ میں خدا کو اس کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس وقت سے ان کی تخلیقی فعالیت زیادہ سے زیادہ آگے بڑھتی گئی۔ اور تقریباً ہر سال دوسری شاندار تخلیق وجود میں آتی رہی۔ غنائی شاعر، جو محبت وغم کا ترجمان تھا، آہستہ آہستہ ناپید ہوگیا اور فلسفی واخلاقی شاعر کے لئے راستہ ہموار کرگیا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اس وقت اقبال بارہ برس کے تھے۔ کانگریس کی بنیاد وکٹورین انتہا پسندی کے اصولوں پر مبنی تھی۔ جیوں جیوں وقت گزرتا گیا یہ تنظیم روز افزوں شہرت حاصل کرتی گئی۔ کیوں کہ اس کی بدولت ہندو اپنے قوم کے ثقافتی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی تخلیقِ نو کے لئے سرگرم کار تھے۔

ہندوستانی برصغیر کے مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے بالکل مختلف تھی۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے ہندوستان میں سیاسی طاقت مسلمانوں سے پورے طور پر چھین لی تھی اور مسلمان علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا تھا۔ سید احمد بریلوی کے معتقد مجاہدین سرحد پر انگریزوں سے برسرِ پیکار تھے۔ اور مسلمانوں پر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی بغاوت برپا کرنے کا الزام عائد تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو فرو کر دینے کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو کچلنے کی پالیسی اختیار کی ۔ اور ہندوؤں نے اپنے سیاسی اور معاشی مفاد کے لئے اس پالیسی کی حمایت کی ۔

مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کا نقطۂ نظر ۱۸۷۰ء میں سیّد احمد خاں کی سچی اور انتھک کوششوں کی بدولت تبدیل ہوا ۔ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے ۔ جنھوں نے محسوس کیا تھا کہ عہد وسطیٰ کی مسلم سیاسی ، سماجی ، ثقافتی ، تعلیمی اور معاشی نظام دورِ حاضر میں نافذ نہیں کیا جا سکتا ۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بدلے ہوئے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے نئے سماجی اور معاشی نظام ضروری ہیں ۔ ایسے نظام تو اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ مسلمان اپنے پرانے طریقۂ تعلیم کو خیر باد نہیں کہتے ۔ نئے علوم کو اپنے اندر جذب نہیں کرتے اور زندگی کے بارے میں انقلاب انگیز نقطۂ نظر نہیں اپناتے ۔

سید احمد خاں کے تجربے نے انھیں دکھلا دیا تھا کہ ہندو اکثریت مسلمانوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں رکھتی ۔ بلکہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی سے خائف تھے ۔ چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جدید تعلیم کے حصول اور اپنی معاشی زندگی کی ترقی کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوں ، اُن کا یہ خیال تھا کہ مسلمان بہ ہر طور انگریزوں کی حمایت کو ترک نہ کریں ۔

اس لئے ۱۸۸۶ء میں سیّد احمد خاں نے انڈین نیشنل

کانگریس کی مخالفت میں علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے سال اپنی مشہور تقریر میں انھوں نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ تعلیمی اور معاشی اعتبار سے وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بھی بتایا کہ اگر ہندوستان میں جمہوری اصول متعارف کئے گئے تو مسلمان خود کو ہندوؤں کے رحم وکرم پر پائیں گے۔

۱۸۹۳ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس تلک کے زیرِ اثر آئی۔ اور اس ہندو قوم پرست کی آتش خیز تقریروں سے بمبئی میں بھیانک ہندو مسلم فساد برپا ہوا۔ سید احمد خاں نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے "محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس آف اپر انڈیا" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ ان کی رحلت کے دو برس بعد یعنی ۱۸۹۸ء میں جب ہندوؤں نے ہندوستان میں اُردو کو ہٹانے اور اس کی جگہ ہندی کو لانے کی تحریک چلائی۔ علی گڑھ میں " اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" کی بنیاد پڑی۔ دوسرے سال علی گڑھ میں محمڈن پولٹیکل آرگنائزیشن کا وجود عمل میں آیا۔ اگرچہ یہ تنظیم ۱۹۰۳ء تک سرگرم عمل رہی۔ یہ مسلمانوں کو سیاسی زندگی میں تربیت دینے کی بجائے صرف انگریزوں کی طرف داری کرتی رہی۔

۱۹۰۶ء میں جب یہ ظاہر ہوا کہ انگریز انڈین نیشنل کانگریس کے دباؤ میں آکر ہندوستان میں جداگانہ انتخابات

کی صورت رائج کرنے جا رہے ہیں مسلم اعلیٰ طبقے کے افراد اور زمین دار حلقوں نے سرسید احمد خاں کی سیاسی پالیسی کی ہمیشہ پیروی کی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قائم کی۔ یہ تنظیم انقلابی یا ترقی پسندی کی۔ انتہا پسندی کے اصولوں پر مبنی نہیں تھی۔ بلکہ قدامت پرستی اور رجعت پسندانہ اصولوں پر منحصر تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ مسلم عوام سے زندہ و پائندہ روابط پیدا کرنے میں ناکام رہی۔ بہ ہر حال ایک چیز حاصل ہوئی وہ یہ کہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ اس تنظیم کی بدولت تسلیم کر لیا گیا۔

مسلم تاریخ کے اس بدلتے ہوئے حالات میں اس طرح کی قائم شدہ تنظیموں کے مقاصد بہت محدود تھے۔ انھیں سیاسی تنظیمیں نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ ان کے مقاصد انگریزوں کی غیر مشروط حمایت اور مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج تک محدود تھے۔ نیز ہندو اکثریت کی ابھرتی ہوئی طاقت سے اپنا دفاع بھی مقصود تھا۔ اس طرح گو کہ سید احمد خاں کی زندگی میں اور ان کی رحلت کے بعد مسلم اعلیٰ طبقے اور زمین داروں کی پرانی اور نئی نسل سرسید کے سیاسی خیالات کی تائید کرتی رہی۔ لیکن متوسط طبقے کے مسلمانوں کی نوجوان نسل نے چند سال تک ان خیالات کی حمایت کی اور ان کی رحلت کے بعد انھوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اقبال مسلمانوں کے متوسط طبقے کی نئی نسل

سے تعلق رکھتے تھے ۔ اُنھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سیال کوٹ میں مولانا سید میر حسن سے حاصل کی ۔ مولانا، سید احمد خاں کے ایک پُرجوش عقیدت مند تھے ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال مولانا کی وساطت سے علی گڑھ تحریک سے روشناس ہوئے ۔ اور انھوں نے اس کے مقاصد کو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں حق بجانب ثابت کیا۔

اقبال نے سیال کوٹ چھوڑا اور بائیس برس کی عمر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور آ گئے۔ دوسرے حساس نوجوان مسلمان کی طرح وہ اپنے دور کی کشیدگیوں اور محرومیوں سے واقف تھے اور عالمِ اسلام کی زبوں حالی ان سے پوشیدہ نہ تھی۔

عثمانی سلطنت کی بنیادیں لرز رہی تھیں ۔ وسطِ ایشیا کی مسلم جمہوریتیں زار کے روس میں ضم ہو گئی تھیں۔ ایران کی قدیم سلطنت زوال آمادہ تھی ۔ اور ملک کی معیشت دم توڑ رہی تھی ۔ چین میں مسلم صوبے چین کی قومی سلطنت میں جذب ہو چکے ہیں ۔ اور مسلمان اپنا منفرد سیاسی وجود کھو چکا تھا۔ مشرقی یورپ سے بھی مسلمان آہستہ آہستہ جلاوطن کئے جارہے تھے ۔ برطانیہ مصر کو پامال کر رہا تھا۔ فرانس مراقش کو ہڑپنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ڈچ ، انڈونیشیا کے مسلمانوں کی بڑی سفاکانہ ایذا رسانی اور ان کے استحصال میں مصروف تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے فرو ہوجانے کے بعد ہندوستانی

برصغیر کے مسلمان اپنی کھوئی ہوئی آزادی اور سیاسی قوت کو دوبارہ حاصل کرنے کی ساری امیدوں کو خیر باد کہہ چکے تھے۔

اس مایوسی کی حالت میں ہندوستانی مسلمان عثمانی خلیفہ کی قیادت میں اسلامی استحکام کی تحریک کی طرف متوجہ ہوئے۔ عثمانی خلافت اس وقت دنیا میں تنہا آزاد مسلم طاقت کی حیثیت سے باقی تھی۔ لیکن یورپی نو آبادیاتی طاقتیں مسلم تہذیب کے اس آخری آثار کو بھی برباد کرنے کے درپے تھیں۔ برطانوی یونانیوں کو عثمانیوں کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے شہ دے رہے تھے۔ اور اس شہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی برطانوی حکمران سے دشمنی میں اضافہ کر دیا تھا۔

سید احمد خاں ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ غدر کے تباہ کن اثرات کو یاد کر کے انگریزی حکام کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے سیاسی طوفان کے پیش رفت کے تدارک کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ خاص طور سے اس عمارت کو بچانے کی فکر میں تھے۔ جسے انھوں نے مسلم قوم کی پُر امن ترقی اور بہتری کے لئے کھڑی کی تھی۔ اس لئے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو کسی ایسی سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جو عالم اسلام میں ہل چل پیدا کر رہی تھی۔

سید احمد خاں اور ان کے حامیوں نے جب جمال الدین افغانی، ۱۸۸۲ء میں ہندوستان آئے تو اُن کی آتش افروز

دعوت کو مسترد کردیا ۔ اسلامی استحکام کی تحریک پورے طور سے جمال الدین افغانی کی پیدا کردہ تھی ۔ ان کا یقین تھا کہ مسلمانوں میں وحدتِ مقصد ہی ایک ایسا حربہ تھا ۔ جس سے وہ یورپ کی شہنشاہیت کو ناکام بنا سکتے ہیں اور شکست دے سکتے ہیں ۔ عالمِ اسلام کے کچھ ملکوں نے ان کے پیغام کو لبیک کہا ۔ ان کے خیالات کو عام کرنے کے لئے بے شمار تنظیمیں اور ادارے قائم ہوئے ۔ سرسید اور ان کے پیروؤں کے مخالفانہ رویّے کے باوجود بہت سے نوجوان مسلمانوں نے جوش کے ساتھ جمال الدین افغانی کی دعوت کو لبیک کہا ۔ اس مصلح نے ہندوستان میں اپنے بہت سے متبعین چھوڑے ۔ اقبال بھی ہندوستانی مسلمانوں کی نوجوان نسل کے ایک رکن تھے ۔ جو جمال الدین افغانی کی استحکامِ اسلامی کے خواب سے بہت زیادہ متاثر تھے ۔

اقبال نے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان بہت سی نظمیں لکھیں ۔ جن میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالتِ زار پر ماتم کیا ہے اور آزادی کے لئے سخت آزمائش میں مبتلا دنیا کے مسلمانوں کے آلام پر خون کے آنسو بہائے ہیں ۔ انھوں نے مسلم قوم کو "تصویرِ درد" اور "نالۂ یتیم" سے تعبیر کیا ۔ اور "فریاد بہ حضورِ سرورِ کائنات" تخلیق کی ۔

اقبال ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک یورپ میں مقیم رہے ۔ لگتا ہے کہ ان سالوں نے اقبال کو پورے طور سے یقین دلایا کہ مسلم عوام کی سالمیت ہی بقائے اسلام کے لئے تنہا سہارا ہے ۔

انھوں نے اپنے چاروں طرف مسلمانوں کے زوال و درماندگی کا مشاہدہ کیا۔ اور انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ جلد ہی دنیا میں آزاد اسلام کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

اسلامی سالمیت کے خواب کو تسلیم کرنے سے پہلے اقبال اپنے فلسفیانہ اور سیاسی ارتقائے نظریات میں مختلف مراحل سے گزرے۔ مثال کے طور پہ اسی یادداشت کے نمبر شمار ۳۶ میں وہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کے زمانۂ طالب علمی میں ورڈس ورتھ نے انھیں دہریت سے بچالیا۔ زمانۂ طالب علمی کی یہ دہریت ان کے ذہن کے مستفسرانہ اور متجسانہ مزاج کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ ایسے کبھی نہ تھے کہ کسی شے کی معقولیت کو محض دوسروں کی سند پر قبول کرلیں۔ مسلمان صوفیا اس طرح کی دہریت کو حجاب کہتے ہیں۔ اور اس کی دو ذیلی تقسیم کرتے ہیں۔ حجاب کی پہلی قسم وہ پردہ ہے جسے اٹھایا نہیں جاسکتا۔ یہ ایسا ہے گویا کہ آدمی کے قلب پر پورے طور سے مہر لگ گئی ہو۔ یہ ایک مستقل دہریت کی کیفیت ہے۔ جو بالکل ساکن اور ناقابلِ تغیر ہوتا ہے۔

دوسری قسم حجابِ حق ہے جو قابلِ جواز دہریت ہوتی ہے۔ جو شک سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یقین کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ جو ایسے انسان کی اندرونی خودی عرفانِ ذات اور خیر و شر کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کرتی ہے۔ ایسی دہریت ایک متجس ذہن کے ارتقاء فکر میں عارضی حیثیت رکھتی ہے اور یہ بہت سے عظیم مسلم مفکرین

اور دوسرے عقائد کے بہت سے فلسفیوں اور شعراء میں
عام ہے۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اقبال پر ورڈس ورتھ
کا یہ اثر کیوں پڑا۔ جب کہ اقبال کو روایتی مسلم تعلیم دی گئی تھی۔
اقبال کا استفسار بہ ہر حال اپنی روایت کی تنگ دامانی سے انحراف
پر آمادگی کو ظاہر کرتا ہے۔ چوں کہ وہ انیسویں صدی کے مغربی
افکار کے ذہنی اضطراب میں داخل ہو چکے تھے، اس لئے یہ تعجب
کی بات نہیں ہے۔ کہ انھوں نے عقلیت کے کھوکھلے پن کا
ایک معقول جواب ورڈس ورتھ کے یہاں دریافت کیا۔ ایسا
ہی دوسرے متلاشی مفکرین نے بھی کیا ہے جیسے جان اسٹورٹ
مل نے۔ یہ ان کے ذہن کی خوبی اور ندرت ہے کہ وہ اپنے زمانے
کے افکار کی عام دہریت اور مادی رجحانات میں زیادہ گہرائی کے
ساتھ نہیں بیٹھے۔

اسلامی تصوف کا ہر طالب علم کہے گا کہ ورڈس ورتھ
ابن العربی کے وحدت الوجودی تعلیمات سے بہت قریب ہے۔
اس لئے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ اقبال اپنے ذہنی ارتقار
کے اس تغیر پذیر دور میں وحدت الوجودی ہو گئے۔ اور انھوں نے فارسی
کے مشہور وحدت الوجودی شاعر حافظ کے اثرات قبول کئے۔ انھوں نے غزل
کی شاعری سے ابتدا کی اور اسی وقت وحدت الوجودی فلسفہ پر اپنے
سیاسی خیالات کی بنیاد رکھی۔ اسی رعایت سے انھوں نے ہندوستانی
قومیت کی حمایت میں نظمیں لکھیں۔ لیکن یہ بھی ایک عارضی صورت
تھی۔ یورپ کے تین سالہ قیام نے اقبال کے ذہن میں ایک
بھرپور انقلاب پیدا کیا۔ انھوں نے فلسفہ وحدت الوجود

کو غیر تشفی بخش سمجھ کر ترک کر دیا۔ اور اس کی جگہ اسلامی سالمیت کے نظریہ کو اپنے فکر کی اساس قرار دیا۔ بعد میں جب مشرقِ وسطیٰ جغرافیائی قومیت کے فریب میں آیا تو اقبال ہندوستانی برصغیر میں مسلم قومیت کے سب سے پہلے ترجمان ثابت ہوئے۔ اور اپنی وفات ۱۹۳۸ء تک اس مقصد کی پرزور حمایت کرتے رہے۔ یہ مسلم قومیت کا فروغ تھا جس نے ہندوستانی قومی تحریکِ آزادی کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ اور جو آخرکار اسلام کو ہندوستان سے علیحدہ کرنے کا سبب بنا۔ اقبال کا ایک خط مورخہ ۱۹۰۹ء ان کے اندر پیدا شدہ اس تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"میں خود اس رائے کا حامی رہا ہوں کہ مذہبی اختلافات کو اس ملک (ہندوستان) سے نابود ہو جانا چاہیئے۔ اور میں اسی اصول پر اپنی نجی زندگی میں بھی کاربند ہوں۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کے لئے ان کے جداگانہ قومی وجود کا تحفظ زیادہ بہتر ہے۔ ہندوستان کے لئے ایک مشترک قومیت کا خواب ایک حسین تصور ہے۔ اور اس میں ایک شاعرانہ کشش بھی ہے۔ لیکن موجودہ حالات اور دونوں قوموں کے لاشعوری رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہ ناقابلِ تکمیل معلوم ہوتا ہے۔"

(سفینۂ حیات از ب، ق، فرخ ص ۳)

اگر اقبال قیام پاکستان (ان کے تصوراتی اور غیر واضح تصور کو ٹھوس شکل میں) کی عمل پذیری کو دیکھنے کے لئے زندہ رہتے۔

تو وہ اس تصور کو آگے بڑھاتے اور ایک ایسے تصور کی بنیاد رکھتے جس کا نام "پاکستانی قومیت" ہوتا۔ ان کا انتقال اس وقت ہوا جب کہ ہندوستانی اسلام اب بھی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں سے چھٹکارا پانے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ ایسا وقت تھا کہ جب علاقائی قومیت یا ہندوستانی برصغیر میں حب الوطنی کی تائید کا مطلب مسلمانوں کا اکثریتی طبقے میں ضم ہو جانا تھا۔ اور اس انضمام سے ان کے امتیازی سیاسی وجود کا خاتمہ تھا۔ اس لئے اقبال نے علاقائی قومیت اور حب الوطنی کی تردید کے لئے ایک مذہبی فلسفیانہ قابلِ قبول جواز فراہم کیا حالاں کہ اس فراہمی میں خونِ جگر صرف کرنا پڑا۔ اگرچہ مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں انھوں نے علاقائی قومیت اور حب الوطنی کے فروغ کی تائید کی۔ خود اُن کے الفاظ میں:۔

"اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموسِ وطن کے لئے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور کا کردار ادا کرنا شروع کر دیتی ہے اور انسانی سالمیت کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے، اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت

سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دیگر
اسلامی ممالک میں قومیت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں
ہو سکتا۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے
اور یہاں کی اقلیتیں جیسے یہودی، عیسائی اور زرتشتی
اسلامی قانون کی رو سے یا تو اہل کتاب ہیں یا
اہل کتاب سے مشابہ ہیں۔ جن سے معاشی اور ازدواجی
تعلقات قائم کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے بالکل
جائز ہے۔ قومیت مسلمانوں کے لئے صرف ان ممالک
میں مسئلہ بنتی ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں
قومیت کا یہ تقاضہ ہو کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔
جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اسلام
قومیت کو خود سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ کیوں
کہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔
جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ مسلمانوں کی
یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے
خود مختاری حاصل کی جائے، حق بجانب ہو گی۔
دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہیں۔"

(مضامین اقبال ص ۱۷۶)

۱۹۰۸ء میں جب وہ یورپ سے لوٹے تو مشرق وسطیٰ
میں مسلمانوں کی حیثیت بہت ہی غیر محفوظ تھی۔ یورپی نو آبادیاتی طاقتیں
یا تو مسلمانوں کے علاقوں پر معاشی دباؤ ڈال رہی تھیں۔ یا انھیں
یکے بعد دیگرے اپنے تسلط میں لے رہی تھیں۔ پورے مشرق وسطیٰ

میں اضطراب تھا - یورپی نوآبادیاتی طاقتوں کی توسیع پسندی کی پالیسی کے نتیجہ میں تشدد پسند قسم کی مسلم قومیت کو فروغ ملا - اس نے عالم اسلام میں ایک جذبۂ حب الوطنی بیدار کر دیا - پورے مشرق وسطیٰ میں جنگِ آزادی کا منصوبہ بن رہا تھا - لیکن مسلم ہندوستان میں، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، مسلمانوں کے لئے سیاسی سرگرمیاں بالکل ممنوع تھیں - مسلم لیگ پورے طور پر اونچے طبقے کے لوگوں کے چنگل میں تھی - اور یہ لوگ غیر مشروط طور پر انگریزوں کے وفادار تھے - یہ اونچے طبقے کے مسلمان صرف اپنے مفاد کی نگہداشت میں دلچسپی رکھتے تھے - اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے دکھ درد سے بالکل بے تعلق تھے -

اگرچہ سیاسی بے اطمینانی ہندوستانی برصغیر کے مسلم عوام کے دلوں کو حرکت میں لا رہی تھی - لیکن اس وقت ان کی بے اطمینانی کو موثر راستے پر لگانے والی کوئی صحیح قیادت نہ تھی - دوسرے ہی سال بلقان سے مسلمانوں کا اخراج ہو گیا - ایران موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا - اور طرابلس کا میدان مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن چکا تھا - اقبال "شکوہ" و "جوابِ شکوہ" میں ابل پڑے - دوسری حرکی اور تخلیقی نظموں کا ایک سلسلہ جسے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" تیزی کے ساتھ جاری ہوا - اس طرح اقبال کی آواز مسلمانوں کو دھیرے دھیرے حرکت میں لا رہی تھی - اور ان کے لئے ایک سمت متعین کر رہی تھی -

اگرچہ کسی دوسرے مسلم شاعر پر لکھے گئے ذخیرہ

ادب کے مقابلے میں اقبال پر کہیں زیادہ لکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اب بھی وہ اسباب فراہم نہیں ہو سکے ہیں۔ جو اس انسان کی انسانیت اور اس کی ہمہ جہتی اور جس
دنیا میں وہ رہتا تھا۔ اس سے اس کی گہری وابستگی اور اس کے لئے اس کے حیات بخش پیغام سے انصاف کر سکیں۔ اقبال نے یہ کیا کہ اسلام کے ماضی سے فیضان حاصل کیا۔ اور اپنے عصری مسائل کے تعلق سے اس فیضان کا استعمال کیا۔ وہ کسی طرح بھی مبہم تصورات کے خواب دیکھنے والے یا ماضی کی طرف لو لگانے والے رومانی نہیں تھے۔ بلکہ وہ ہمیشہ بنیادی طور پر ایک حقیقت پسند اور عملی انسان تھے۔ جن کا تمام تر مقصد اپنے پیغام کو عوام تک پہنچانا تھا اور یہ نظر میں رکھنا تھا کہ ان کے تصورات کا ایک مخصوص معاشرہ میں موثر طور پر عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔

اس یادداشت میں بہت سے بڑے بڑے افکار کے مواد موجود ہیں۔ جنھیں بعد میں ان کی شعری اور فلسفیانہ تصانیف میں پروان چڑھایا گیا اور وضاحت کی گئی۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کو ایک عمل سمجھا اور اس کا یقین رکھتے تھے کہ کسی قوم کے روحانی اور فلسفیانہ تصورات زیادہ تر اس قوم کے سیاسی ماحول کے اظہار ہوتے ہیں۔ ان کا یہ بھی یقین تھا کہ مستحکم سیاسی تصورات کا نفاذ عوام کے کردار کی تہذیب کے لئے ضروری ہے۔ تاریخ میں مسلمانوں کے وجود کی انوکھی غرض و غایت پر ان کے یقین اور کردار سازی کے لئے اچھی حکومت کی حیات بخش اہمیت پر ان کی

تنقید میں ہر کوئی ہندوستانی برصغیر کے مسلمانوں کے لئے علٰحدہ ریاست کی ضرورت پر اقبال کے آئندہ اصرار کی بنیاد کا ادراک کر سکتا ہے۔

وہ اس یادداشت میں لکھتے ہیں۔ "طرزِ حکومت جو بھی ہو۔ میرے خیال کے مطابق یہ عوام کے کردار کو متعین کرنے والے عوامل میں سے ہے ..... اپنے سیاسی زوال کے وقت سے ہندوستانی مسلمان بڑی سرعت کے ساتھ اخلاقی انحطاط کا شکار ہوتے رہے ہیں ......
مجھے یقین ہے کہ خدا کی مطلق وحدانیت کی حجتِ واحدہ کی حیثیت سے ہم اب بھی دنیا کے لئے ناگزیر ہیں۔"
(نمبر شمار ۱۲)

اقبال کے نزدیک زندگی کا مقصد جدوجہد ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد ذہنی برتری کی کوشش کے بجائے جدوجہد کے لئے تیاری ہے۔ وہ ضرورت وقت اور طاقت ور انسان کی اہمیت کے بارے میں بار بار گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں تعمیری کام انجام دینے والے گنہ گار بھی بے حس مقدس لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کا زوال جزوی طور پر ان کی منفی خوبیوں جیسے غلامانہ اطاعت و عجز سے ان کی وابستگی کا نتیجہ تھا۔ کچھ مغربی مصنفین نے قوت پر اقبال کے اصرار کی تنقید کی ہے۔ جو ان پر فسطائی رجحان کا الزام رکھتے ہیں۔ ایسے معترضین عام طور پر اس سماجی اور سیاسی پس منظر کی اصل حقیقت کو، جس

میں شاعر گویا تھا، ذہن نشین کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ اقبال کا مقصد مسلمانوں کو حصولِ قوت کے لئے مکمل جواں مردی کے ساتھ جدوجہد کرنے کے لئے انھیں بیدار کرنا تھا۔ کیوں کہ ان کی سیاسی غلامی اور اخلاقی زوال سے انھیں صرف ان کا مجاہدہ ہی بچا سکتا تھا۔

وہ ہندوستانی مسلمانوں کی ملّی، معاشی پستی سے بہت اچھی طرح آگاہ تھے اور ان کی اقتصادی زبوں حالی کو ان کی اخلاقی گراوٹ کے اسباب میں سے ایک اہم سبب سمجھتے تھے۔ اپنی پہلی مطبوعہ اُردو نثر کی کتاب "علم الاقتصاد" میں جسے انھوں نے یورپ جانے سے پہلے لکھا تھا۔ انھوں نے زور دیا کہ ملک میں خوفناک غربت کی وجہ سے مطالعۂ اقتصادیات اشد ضروری ہے۔ ان کے الفاظ میں وہ قومیں جو اپنے سماجی اور اقتصادی حالات کو بہتر نہیں بناتیں یقیناً معدوم ہو جاتی ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اب تک اقبال پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وہ سب ان کے مقاصد کو عوام تک پہنچانے میں عام طور سے ناکام ہوئی ہیں۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ ان کے انتقال کے بیس برس بعد بھی اقبال پر لکھی گئی بیشتر تصانیف (سطحی) معمولی اور غیر اہم ہیں۔

اس کا ایک سبب پاکستان میں اقبال کے اکا دکا اشعار کو نقل کرنے، یا اقبال کے قول، یا نفسِ مفہوم یا ان کے سیاق و سباق کے کسی گہرے مطالعے کے بغیر ان کے افکار پر گفتگو کا بڑھتا ہوا رجحان معلوم ہوتا ہے۔ ملّت پر گفتگو کرتے وقت اقبال نے

اس یادداشت میں ملٹن کے بارے میں مشہور فرانسیسی طنز نگار والٹیر کا قول نقل کیا ہے کہ (نمبر شمار-۴۹) ملٹن کی شہرت بڑھتی جائے گی کیوں کہ اسے کوئی نہیں پڑھتا۔ والٹیر کا یہ قول پاکستان میں اقبال کے بارے میں بھی اتنا ہی صادق آتا ہے۔

دوسرا سبب وہ سیاسی اہمیت معلوم ہوتی ہے جو ان کی ذات سے منسوب ہے۔ پاکستان کے بائیں بازو کے دانش وروں نے ہمیشہ اقبال کو مانعِ راہ، ایک زبردست رکاوٹ یا ایک طرح کی حفاظتی دیوار سمجھا ہے۔ جسے قبل اس کے کہ مسلمان ان کے ترقی پسندانہ نظریات کو قبول کریں، منہدم ہو جانا چاہیئے۔ اس لئے بائیں بازو کے دانش ور جہاں کہیں بھی موقع ملتا ہے اقبال کو نیچے گرانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کے دائیں بازو کے دانش ور ہیں جنھیں اقبال کو اپنانے کا دعویٰ ہے۔ وہ اقبال کے بارے میں پہلے سے سوچا سمجھا اپنا تصوّر رکھتے ہیں۔ وہ لوگ بے شک اسلام کے حق میں ہیں۔ لیکن بائیں بازو کے ناپاک ہاتھوں (اور مذہبی یا علیحدگی پسندی کی بنیادوں پر، یا صوبائی یا علاقائی عصبیت کی وجہ سے اقبال کو بدنام کرنے والوں) سے اقبال کی دفاع کے لئے اپنے جوش میں اقبال کو ان خیالات کو حامل مسلمان شاعر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جو ان کے مطابق اقبال کو رکھنا چاہیئے تھا۔ نتیجہ کے طور پر اقبال کو بطور قدامت پسند اور رجعت پسند پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اور دانش وروں کے اس گروہ نے اقبال پر جو کچھ بھی لکھا ہے۔

وہ اُن کے افکار کی اضطرابی حرکی اور مستقبل بیں خصوصیات کی گرفت
یا تعبیر میں ناکام ہے۔

ایک دوسرا سبب مبہم اور خیالی چیزوں سے قرونِ
وسطیٰ کے طرز کی وہ وابستگی ہے۔ جو ہمارے بیشتر صاحبانِ
علم وفضل کا خاصہ ہے اور جو ان کے ذہنوں کو مفلوج کر دیتی ہے
اور جو ہمارے اندر صحیح اور تخلیقی تلاش و جستجو کے نشو و نما کو
روک دیتی ہے۔ ایسے محققین صرف جامد تحقیق کی طرف مائل رہتے
ہیں۔ اور ان کی یافت کا ماحصل زندہ اور انسانی بت شکن اقبال
کو ایک مُردہ اور کریہہ مجسّمہ کی صورت میں پیش کرنا ہے۔ یہ لوگ
ہمیں بتاتے ہیں کہ اقبال کی عظمت وہاں معلوم ہوتی ہے۔ جہاں
وہ سمجھ میں نہ آسکیں۔ اور وہاں نہیں جہاں ان کے مقاصد نافذ
کئے جاسکیں۔ اقبال کے بارے میں ایسے ادب کا نتیجہ انھیں
دیوار پر ایک ذبابِ مردہ کی طرح چسپاں کر دینا ہے۔ بجائے
اس کے کہ ان کے پیغام کو عوام تک پہنچائیں تاکہ وہ ہمارے ذہنوں
میں ایک زندہ قوت بن جائیں اور ہماری ثقافتی، سماجی، اقتصادی
اور سیاسی زندگی کی تشکیلِ نو کی جدوجہد میں ہمیں بیدار کریں،
ہماری ہدایت اور دست گیری کریں۔

یہ دانش ور عام طور سے اقبال کے مقاصد کو ہمارے
عصری مسائل سے اس طرح ہم آہنگ کرنے میں ناکام ہیں۔
جس طرح شاعر نے ماضیٔ اسلام کو اپنے دور کی جدوجہد سے ہم آہنگ
کیا۔ تعلیماتِ اقبال کا عقدۂ مشکل مستقبل کے مسلم سماج کا خواب ہے۔

ایک ایسا سماج جو خدا کے شریکِ کار کی حیثیت سے افراد کے مکمل نشو و نما کی لگن رکھتا ہے۔ اس لئے اقبال ہندوستانی برِصغیر میں پہلے مسلمان تھے جس نے اسلامی سوشلزم کے قیام کا باضابطہ مطالبہ کیا۔ اقبال کے پیغام کا صحیح ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ اُن معاشی اور دوسرے شعبوں کی ترقی ہو۔ جن کے ذریعہ ان کے خواب کی تعبیر پوری ہو سکے۔ اقبال پُرجوش جدوجہد کی علامت تھے۔ وہ متکلمانہ سخن سازی کے حق میں نہ تھے۔ اقبال کے پیغام کو مقبولِ عام بنانے کی کوششوں کے باوجود بدقسمتی سے وہ ایک بیش بہا جوہر کی طرح غبار میں پوشیدہ رہا۔

یہ یادداشت اقبال کے اُن مسودات کا جزو ہے، جس میں خطوط، غیر مطبوعہ مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ میری تمنا ہے کہ ان مسودات کو رفتہ رفتہ مرتب کر کے اُنھیں شائع کروں۔ یہ یادداشت اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اقبال کی متفرق نگارشات — وغیرہ، جس طرح اقبال نے ترتیب دیا تھا۔ اسی طرح بدستور باقی ہیں۔ جن مختلف موضوعات کے تحت اقبال نے اس یادداشت میں اظہارِ خیال کیا ہے؛ ان کے لئے نمبروں اور عنوانات کے اضافے کے علاوہ اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ یہ اضافے اس لئے کئے گئے ہیں کہ ہم ان خیالات کے تنوع اور گہرائی (لطافت) کو کچھ سمجھ سکیں جو ان کے فکری ارتقا کے اس تشکیلی دور میں فکرِ شاعر پہ حاوی تھے۔

جاوید اقبال
علامہ اقبال روڈ، لاہور

۱

فن

فن ایک مقدّس جھوٹ ہے۔

۲

دریافت

ہماری روح کو اُس وقت اپنا عرفان حاصل ہوتا ہے، جب ہم کسی مفکر سے روشناس ہوتے ہیں۔ جب تک میں گوئٹے کے تصوّرات کی لامتناہیت سے بے خبر تھا۔ اس وقت تک میں اپنی کم مائیگی پر مطلع نہ تھا۔

۳

عقلِ انسانی

فطرت کی خود انتقادیت کی کوشش کا نام عقلِ انسانی ہے۔

۴

معاشیاتِ خیر بخشی

مخیر انسان درحقیقت غیر مخیر کی مدد کرتا ہے۔ کسی محتاج کی نہیں۔ کیوں کہ جو کچھ ان غریبوں کو دیا جاتا ہے، فی الحقیقت وہ انھیں دیا جاتا ہے جو تنگ دستوں کو کچھ بھی نہیں دیتے۔ اس طرح غیر مخیر اپنی حالتِ بخل میں پڑا رہتا ہے، اور سخی انسان ان کا کفارہ ادا کرتا رہتا ہے۔ یہی معاشیاتِ خیر بخشی ہے۔

۵

وجودِ باری تعالیٰ

میرے دوست اکثر مجھ سے سوال کرتے ہیں۔ "کیا تم خُدا کے وجود پر یقین رکھتے ہو۔؟" قبل اس کے کہ میں اس سوال کا جواب

دوں - میں سوچتا ہوں کہ اس سوال میں مستعمل اصطلاحات کے مفاہیم جاننے کا مجھے حق حاصل ہے - اگر میرے دوست اپنے سوال کا جواب چاہتے ہیں تو ان کو مجھے پہلے سمجھانا چاہیئے کہ "یقین"، "وجود"، اور "خدا"، بالخصوص آخر الذکر دو لفظوں سے ان کی کیا مراد ہے -؟ مجھے اعتراف ہے کہ میں ان اصطلاحات کو نہیں سمجھتا ہوں، اور جب میں ان سے جرح کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی ان دونوں (اصطلاحات) کو نہیں سمجھتے -

۶

ایک مکالمہ

دل :- یہ مطلقاً صحیح ہے کہ خدا ضرور موجود ہے -

دماغ :- لیکن میرے پیارے بچے! وجود تو میری ایک صفت ہے - اور تمہیں اس کے استعمال کا کوئی حق نہیں -

دل :- میرے ارسطو! یہ تو اور بھی بہتر ہے -

۷

تسکین پندار

پندار کی تسکین ہمارے لیے معاشی اہمیت رکھتی

ہے۔ اگر مجھے "ہاسپٹل اسسٹنٹ" کے بجائے "سب اسسٹنٹ سرجن" پکارا جائے، تو میں اپنی تنخواہ میں اضافہ کے بغیر بہت مطمئن ہوں گا۔

۸

بے رحمانہ نفسیاتی تجزیہ

میں اس بے رحمانہ نفسیاتی تجزیہ کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ اپنی مہم میں ناکام ہوتے ہیں۔ اور ترکِ وطن کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں اور دوسری اقلیم میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ کی ناکامی نے آپ کے حوصلے کے لئے مہمیز تازہ کا کام کیا ہو۔ بلکہ ایسا بالخصوص اس وجہ سے ہے کہ آپ ان لوگوں سے روپوش ہونا چاہتے ہیں۔ جو آپ کی ناکامی کے شاہد ہیں۔

۹

قوتِ یقین

یقین ایک بڑی طاقت ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ دوسرا بھی میرے افکار کا موید ہے، تو اس کی صداقت کے بارے میں میرا اعتماد بے انتہا بڑھ جاتا ہے۔

۱۰

اِسلام کا خُدا

عیسائیت خدا کو محبت بتاتی ہے۔ اور اسلام طاقت۔ ہم دونوں تصورات کے مابین کیسے فیصلہ کریں؟ میں سمجھتا ہوں کہ تاریخِ انسانی اورتاریخِ کائنات کو بہ حیثیت مجموعی چاہیئے کہ ہمیں بتائے کہ ان دونوں تصورات میں سے کون زیادہ صحیح ہے۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ خدا تاریخ میں خود کو محبت کے مقابلے میں بہ طور طاقت زیادہ نمایاں کرتا ہے۔ میں خدا کی محبت سے انکار نہیں کرتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تاریخی تجربات کی بِنا پر خدا کو بہ طور طاقت پیش کرنا زیادہ بہتر ہے۔

۱۱

ہیگل کا نظامِ فکر

ہیگل کا نظامِ فکر رزمیہ شعرِ منثور ہے۔

۱۲

۱۵ / مئی سنہ ۱۹۱۰ء

کل صبح تقریباً چار بجے میں نے اپنے نصف کُرّہ کے اس پُرشکوہ
مہمان کو دیکھا ، جو ہیلے کے دنبالہ دار ستارہ کے نام سے مشہور ہے۔
لامحدود فضا کا یہ خوش رنگ شناور ۷۶ برسوں میں ایک بار ہمارے
آسمانوں پر نمودار ہوتا ہے ۔ میں اُسے دوبارہ صرف اپنے پوتے کی نظر
سے دیکھوں گا ۔ (اس وقت) میری ذہنی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ میں
نے ایسا محسوس کیا، جیسے کوئی ناقابلِ بیان پہنائی میری خاکستر کے تنگ
حدود میں بند ہو کر رہ گئی ہو ۔ پھر بھی اس جادہ پیما کو دوبارہ نہ
دیکھ سکنے کے خیال نے میرے اوپر خود میری بے مائیگی کی دردانگیز
حقیقت منکشف کر دی ۔ اس وقت (عارضی طور پر) میرے سارے
حوصلے سرد ہو کر رہ گئے ۔

۱۳

طرزِ حکومت

الگزنڈر پوپ کہتا ہے ۔ ”بے وقوفوں کو طرزِ حکومت پر
جھگڑنے دو ۔“ میں اس سیاسی فلسفہ سے اتفاق نہیں کر سکتا ۔ طرزِ
حکومت جو بھی ہو ۔ میرے خیال کے مطابق یہ عوام کے کردار کو متعین

کرنے والے عوامل میں سے ہے۔ سیاسی طاقت کا سقوط قومی کردار کے لئے اسی طرح تباہ کن ہے۔ اپنے سیاسی زوال کے وقت سے ہندوستانی مسلمان بڑی سرعت کے ساتھ اخلاقی انحطاط کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ دنیا کے سبھی مسلم ممالک کے مقابلے میں ہندوستانی مسلمانوں کا کردار شاید سب سے زیادہ گرا ہوا ہے۔ میرا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم اس ملک میں اپنی عظمتِ رفتہ پر ماتم کریں۔ کیوں کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس بارے میں، میں بھی قریب قریب تقدیر پرست ہوں، کہ مختلف قوتیں ہی آخر کار قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کرتی ہیں۔ سیاسی طاقت کے طور پر شاید اب ہماری کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ خدا کی مطلق وحدانیت کی حجتِ واحدہ کی حیثیت سے ہم اب بھی دنیا کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس لحاظ سے قوموں کے درمیان ہماری قدر و قیمت خالصتہً بدیہی ہے۔

۱۴

شاعری اور منطقی صداقت

شاعری میں منطقی سچائی کی تلاش بالکل بے کار ہے۔ تخیل کا نصب العین حسن ہے، نہ کہ سچائی۔ اس لئے کسی فن کار کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی تخلیقات میں سے وہ اقتباسات پیش نہ کیجئے۔ جو آپ کی رائے میں سائنسی حقائق پر مشتمل ہوں۔

شخصی بقائے دوام[15]

شخصی بقائے دوام کوئی حالت نہیں بلکہ ایک طریق عمل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روح اور جسم کی تفریق نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ متعدد مذہبی نظام اس غلط تفریق پر مبنی ہیں۔ انسان بنیادی طور پر ایک قوت — ایک طاقت ہے۔ بلکہ ایسی طاقتوں کا مرکب ہے۔ جس میں متعدد تراکیب کی گنجائش ہے۔ ان طاقتوں کی ایک متعین ترکیب شخصیت ہے۔ اگر یہ بالکل اتفاقی ترکیب ہے تو یہاں مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں اسے منجملہ حقائق فطرت سمجھتا ہوں۔ اور اس بات کو جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ کیا یہ طاقتوں کی ترکیب یا تنظیم، جو ہمیں اتنی عزیز ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں برقرار رہ سکتی ہے۔ کیا تب یہ ممکن ہے کہ یہ طاقتیں برابر اسی سمت میں سرگرم کار رہیں۔ جیسا کہ وہ ایک زندہ و توانا شخصیت میں ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہے، انسانی شخصیت کو ایک دائرے سے ظاہر کیا جائے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ طاقتیں ایک ایک ایسے مخصوص دائرے کے اظہار پر منتج ہیں جو اپنی اخلاقی طاقتوں کی ترکیب یا تنظیم کی شکست و ریخت سے معدوم ہو سکتا ہے۔ پھر ہم کیسے اس دائرے کے تسلسل کو برقرار رکھ سکتے ہیں؟ بہ ظاہر صرف اس طرح سے کہ ہم وہ قوت پہنچائیں جو ان کی تشکیلی قوتوں کے معمولاتِ عامہ میں ممد و معاون ہو۔ ان سبھی طریقۂ کار کو ترک کر دینا

چاہیئے ۔ جن میں شخصیت کو مضمحل کرنے کا رجحان موجود ہو۔ جیسے عجز، قناعت، غلامانہ تابعداری، اور انسانی عمل کے وہ طریقے، جنھیں غلطی سے خیر کا نام دے کر پُر وقار بنا دیا گیا ہے ۔ دوسری طرف بلند ہمتی، اولوالعزمی، فراخ دلی، فیاضی، اور اپنی قوت و روایات پر فخر، شخصیت کے شعور کے لئے حصار کا کام کرتے ہیں۔

شخصیت، چونکہ انسان کا عظیم ترین سرمایہ ہے، اس لئے خیر قطعی سمجھنا چاہیئے ۔ اسے ہمارے اعمال کی قدر و قیمت کا معیار ہونا چاہیئے ۔ وہی خیر ہے جو ہمیں شخصیت کا شعور بخشتا ہو۔ وہی شر ہے جو شخصیت کو کچلنے اور بالآخر اس کو نابود کرنے کا میلان رکھتا ہو۔

ایک ایسا طرزِ حیات اختیار کر کے، جس کا مقصد شخصیت کا استحکام ہو، ہم فی الحقیقت موت کے خلاف معرکہ آرا ہوتے ہیں۔ جو ایک ایسی ضرب ہے، جو قوتوں کی اس تنظیم کو تباہ کر دیتی ہے جسے ہم شخصیت کہتے ہیں ۔ شخصی بقائے دوام دراصل ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے ۔ شخصی بقا کی حفاظت کے لئے اسے ایک جدوجہد کی ضرورت پڑتی ہے ۔ وہ خیال جسے میں نے یہاں پیش کیا ہے ۔ بہت ہی دور رس نتائج کا حامل ہے ۔ کاش مجھے اتنا وقت مل جائے کہ میں اسلام، بدھ مت، اور عیسائیت کے تقابلی قدر و قیمت پر بحث کرسکوں ۔ لیکن بدقسمتی سے میں اتنا مصروف ہوں کہ یہ تفصیلات پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

۱۶

تاریخ

تاریخ ایک طرح کی عملی اخلاقیات ہے۔ دوسرے علوم کی طرح اگر اخلاقیات ایک تجرباتی علم ہے۔ تو اُسے انسانی تجربات کے انکشافات پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اس نقطۂ نظر کے برملا اظہار سے ان لوگوں کے بھی نازک احساسات کو یقیناً صدمہ پہنچے گا۔ جو اخلاق کے معاملے میں سخت گیر ہونے کے دعوے دار ہیں۔ لیکن جن کا عوامی کردار تاریخی تعلیمات سے متعین ہوتا ہے۔

۱۷

مابعد الطبعیات

مجھے تسلیم ہے کہ میں تصوف سے کچھ بے زار ہوں۔ لیکن جب کبھی میں لوگوں سے استدلال کرتا ہوں تو یہی پاتا ہوں کہ ان کے دلائل ہمیشہ چند ایسے قضیات پر مبنی ہوتے ہیں۔ جسے وہ آنکھ بند کر کے اختیار کرتے ہیں۔ اس لئے میں ان دعووں کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے مجبور ہوتا ہوں۔ عمل اپنی ہر صورت میں مجھے قیاس کی جانب واپس لے جاتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجموعی طور پر مابعد الطبعیات سے دامن کشاں ہونا ناممکن ہے۔

۱۸

مذہبی جنون

تمام قومیں ہم پر مذہبی جنون کا الزام لگاتی ہیں، اور میں اسے تسلیم کرتا ہوں ــ میں اور آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ ہم اپنے مذہبی جنون میں حق بجانب ہیں۔ حیاتیات کی زبان میں مذہبی جنون اصولِ انفرادیت کے سوا کچھ بھی نہیں، جو کسی جماعت میں کارفرما ہوتا ہے۔ اس خیال کے تحت زندگی کے تمام روپ کم وبیش مذہبی جنون میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور انھیں ضرور ایسا ہونا چاہیئے۔ اگر انھیں اپنی اجتماعی زندگی کا خیال ہے۔ اور امرِ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام قومیں متعصب ہوتی ہیں۔ کسی انگریز کے مذہب کی تنقید کیجئے وہ خاموش رہے گا۔ لیکن اس کی تہذیب، ملک یا، کسی میدانِ عمل میں اس کی قوم کے رویّے پر تنقید کرکے اس کی طبعی عصبیت کو بیدار کریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی قومیت مذہب پر منحصر نہیں ہوتی۔ یہ جغرافیائی بنیاد رکھتی ہے۔ یعنی اس کا وطن۔ جب آپ اس کے وطن پر تنقید کرتے ہیں تو اس کا تعصب بجا طور پر مشتعل ہوجاتا ہے۔ ہماری کیفیت بہ ہر حال اساسی طور پر مختلف ہے۔ قومیت ہمارے لئے ایک خیال محض ہے۔ اس کی کوئی مادی بنیاد نہیں ہے۔ ہمارا اجتماعی نقطہ دنیا کے چند نقطہ ہائے نظر سے ایک طرح کی ذہنی مفاہمت ہے۔ ہمارا تعصب اُس وقت بیدار ہوتا ہے۔ جب ہمارے مذہب کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تو میں سوچتا ہوں کہ ہم اپنے تعصب میں اسی طرح حق بجانب ہیں۔ جیسے ایک انگریز ہے۔ جب اس کی

تہذیب کو نشانۂ تنقید بنایا جاتا ہے ۔ دونوں حالتوں میں احساس ایک ہی ہے ۔ اگرچہ دونوں مختلف مقاصد سے متعلق ہیں ۔ وہی حب وطن اگر مذہب کے لئے ہے تو جنون ہے اور وہی جنون اگر ملک کے لئے ہے تو حبِ وطن ہے ۔

۱۹
حب الوطن

اسلام کا ظہور، بُت پرستی کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر ہوا اور حب الوطنی ــــ بت پرستی کی ایک لطیف صورت کے سوا اور کیا ہے ۔ ایک مادی شئے کو معبود کا درجہ عطا کیا گیا ہے ۔ اور میرے اس خیال کی تصدیق و توثیق مختلف قوموں کے وطن پرستانہ ترانے کریں گے ۔ اسلام بت پرستی کی کسی شکل کو بھی برداشت نہیں کر سکا ۔ یہ ہمارا ازلی و ابدی نصب العین ہے کہ ہم بت پرستی کی تمام صورتوں کے خلاف احتجاج کریں ۔ اسلام نے جس چیز کا قلع قمع کیا ۔ اس کو، اس کی اس عمارت کی بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ جس کی حیثیت ایک ہئیت سیاسیہ کی ہے ۔ یہ حقیقت کہ پیغمبرِ اسلام کا عروج اور وصال ایسے مقام پر ہوا جو اُن کی جائے پیدائش نہ تھا ۔ شاید اس حقیقت کی طرف ایک پُراسرار اشارہ ہے ۔

۲۰

انصاف

انصاف ایک بے کراں خزانہ ہے۔ لیکن ہمیں اسے رحم کے چور سے محفوظ رکھنا چاہیئے۔

۲۱

استحکامِ مسلم

میں نے اوپر جو کچھ اسلام اور حب الوطنی کے بارے میں کہا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بہ حیثیت ایک ملت کے ہمارا استحکام مذہبی اصول کی پیروی پر منحصر ہے۔ جس وقت یہ گرفت کمزور پڑ جاتی ہے۔ ہمارا وجود معدوم ہو جاتا ہے۔ شاید پھر ہمارا بھی وہی حشر ہو جو یہودیوں کا ہوا اور ہم اس گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے کر ہی کیا سکتے ہیں؟ کسی ملت میں مذہب کا خاص امین کون ہے؟ یہ صرف عورت ہے۔ مسلمان عورت کو صالح مذہبی تعلیم ملنی چاہیئے۔ کیوں کہ وہ در حقیقت ملت کی معمار ہے۔ میں کسی مجرد طریقہ تعلیم پر یقین نہیں رکھتا۔ دوسری چیزوں کی طرح تعلیم بھی ملت کی ضرورتوں کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لئے مسلمان لڑکی کے لئے مذہبی تعلیم بہت کافی ہے۔ تمام وہ مضامین جن میں اس کو نسائیت اور اسلام سے محروم کرنے کا رجحان ہو۔ انھیں اس کے نصابِ تعلیم سے بہ طور خاص خارج کر دینا چاہیئے۔

لیکن ہمارے ماہرینِ تعلیم اب بھی تاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔ وہ لوگ ابھی تک ہماری لڑکیوں کے لئے ایک نصابِ تعلیم مقرر نہیں کرسکے ہیں۔ شاید وہ لوگ مغربی تصورات کے حسن وجمال سے اتنے زیادہ خیرہ ہوگئے ہیں کہ وہ اسلامیت، جو خالصتہً ایک مجرد خیال سے قومیت کی تشکیل کرتی ہے یعنی مذہب، اور مغربیت جس کے تصورِ قومیت کا جوہرِ حیات ایک مادی شئے ہے۔ یعنی ملک کے درمیان فرق کرنے سے قاصر ہیں۔

۲۲

جرمن قوم

معاشیاتِ فطرت میں ہر ایک قوم کو ایک کام سپرد ہوا ہے۔ جرمن قوم کا کام علمِ انسانی کی تنظیم ہے۔ لیکن حال ہی میں انھوں نے ایک تجارتی مہم شروع کی ہے۔ جو انھیں ایک سلطنت تو دے سکتی ہے لیکن انھیں ایک نقصان بھی برداشت کرنا پڑے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک اعلیٰ تر تصور کی جگہ ایک ہمہ گیر تجارت کی روح لے لے گی۔

۲۳

جدید ہندو

ایک قوم کے درمیان ایک نئے نصب العین کے آغاز وارتقا پر نظر رکھنا بے حد دلچسپ ہے۔ وہ جوش، جو یہ نصب العین بیدار کرتا ہے۔ اور وہ طاقت جس سے یہ نصب العین ایک قوم کی پوری

توانائی کو ایک مشترک مرکز کی جانب کھینچ لیتا ہے۔ کتنا حیرت انگیز ہوتا ہے۔ جدید ہندو ــــ ایک عجیب وغریب منظر ہے۔ میرے نزدیک اس کا رویہ سیاسی سے زیادہ نفسیاتی مطالعہ کا موضوع ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی آزادی کا تصور ــــ جو اس کے لئے بالکل ہی نیا تجربہ ہے۔ اس کی روح پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہے۔ اور اس نے اس کی طاقت کے مختلف دھاروں کو ان کی مروجہ سمتوں سے موڑ کر عمل کے اس نئے سمت میں لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں وہ اپنی پوری توانائی کو مرکوز کر دے۔ اس تجربہ سے گزر جانے کے بعد وہ اپنے نقصان کو محسوس کرے گا۔ وہ ایک بالکل نئی قوم میں تبدیل ہو جائے گا۔ نیا اس معنی میں کہ وہ اپنے آپ کو اسلاف کے اخلاقی تصورات کے زیرِ اثر کبھی نہیں پائے گا۔ وہ اسلاف جن کے بلند تصورات بہت سے پریشان ذہن کے لئے دوامی تسکین کا سہارا بنے رہے ہیں۔ قومیں تصورات کو جنم دیتی ہیں۔ لیکن تصورات ایک خاص مدت میں نتیجہ خیز ہو کر نئی قوموں کو وجود بخشتے ہیں۔

۲۴

حق اور طاقت

فلسفہ حق کی، اور تاریخ طاقت کی دلیل ہے۔ اس موخر الذکر دلیل کے مقدس قوانین اول الذکر دلیل کے مقابلے میں زیادہ مستحکم دکھائی دیتے ہیں۔

۲۵

افغانستان کا مستقبل

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ دو بڑے ممالک کے درمیان کی کمزور ریاستیں کبھی اس قابل نہیں رہی ہیں کہ خود کو عظیم سیاسی اکائیاں بنا سکیں۔ شام کا یہی حال تھا۔ جو روم و فارس کے درمیان ایک کمزور ریاست تھا۔ افغانستان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنی دشوار معلوم ہوتا ہے۔

۲۶

زندگی بہ حیثیت تنقیدِ شاعری

میتھو آرنلڈ شاعری کو تنقیدِ حیات بتاتا ہے۔ زندگی کو تنقیدِ شاعری کہنا بھی اتنا ہی درست ہے۔

۲۷

یورپی عیسائیت

انسانی دنیائے افکار میں محمدؐ، گوتم بدھ اور کانٹ غالباً سب سے زیادہ انقلاب انگیز تھے۔ دنیائے عمل میں نپولین کا کوئی حریف نہیں۔ میں عیسٰی مسیح کو دنیا کی انقلاب انگیز ہستیوں میں شمار نہیں کرتا۔ کیوں کہ ان کی چلائی ہوئی تحریک

بہت جلد قبلِ مسیح کی بُت پرستی میں ضم ہو گئی تھی۔ یورپی عیسائیت مجھے سامی الہیات کی زبان میں قدیم بُت پرستی کے ایک کمزور (ناقص) ترجمہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

۲۸
عیسیٰ مسیح اور اسپنوزا

یہودی نسل نے صرف دو بڑے انسان عیسیٰ مسیح، اور اسپنوزا پیدا کئے ہیں۔ اول الذکر بیٹے میں اور موخرالذکر کائنات کی صورت میں خدا تھا۔ اسپنوزا اپنی قوم کے سب سے بڑے معلم کی صرف تکمیلی صورت تھا۔

۲۹
ارسطو

میرے دل میں ارسطو کی سب سے زیادہ عزت ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں (بیسویں صدی میں رہ کر) اپنی قوم کی پرانی نسلوں کے مقابلے میں اسے زیادہ بہتر طور پر جانتا ہوں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اس نے ہمارے (مسلمانوں کے) افکار کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ افلاطون کے عقیدۂ تصور پر تنقید کرتے ہوئے اس

کے یہاں ناسپاسی کا جو شائبہ نظر آتا ہے۔ وہ مجھے اس کی بھرپور تعریف کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اپنے استاد افلاطون کے نظریات پر اس نے جو تنقید کی ہے۔ اس کی صداقت سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن میں اس جذبہ کو ناپسند کرتا ہوں، جس کے زیرِ اثر وہ ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۰

نطشے کی دیوانگی

انسانی فطرت میں عجیب و غریب ناہمواریاں ہیں۔ اگر میں کسی طوائف سے شادی کرلوں تو گویا میں اپنے اس عمل سے یہ ظاہر کرتا ہوں کہ میں ایسے رکیک رشتوں پر معترض نہیں ہوں۔ لیکن اگر آپ میرے کردار کو داستان کا ایک موضوع بنالیں تو میں اسے بُرا مانوں گا (گویا) جسے میں عملاً جائز سمجھتا ہوں اُسے اصولاً قابلِ نفریں جانتا ہوں۔ نطشے کا فلسفہ کم سے کم اخلاقیات کی دنیا میں یورپی کردار کے عقلی جواز کی ایک کوشش ہے۔ اس کے باوجود یورپ میں عام طور پر اشرافیہ کے اس بڑے پیغمبر پر ملامت کی جاتی ہے۔ صرف چند ہی نے اس کی دیوانگی کے مفہوم کو سمجھا ہے۔

۱۳

اورنگ زیب

اورنگ زیب کی سیاسی عبقریت بے انتہا جامع تھی۔ دوسرے
مقاصد کی طرح اس کی زندگی کا ایک مقصد اس ملک کی مختلف قوتوں
کو ایک عالم گیر سلطنت کے رشتے میں مستحکم کرنا تھا لیکن اس پرشکوہ
اتحاد کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں اس نے اپنی اس ناقابلِ تسخیر جرات
کے فرمان پر غلطی سے یقین کرلیا، جس کے پیچھے سیاسی تجربہ
کا کوئی بھی شافی و کافی پس منظر نہ تھا۔ اپنی مجوزہ مملکت کے سیاسی
ارتقا میں وقت کی حقیقت کو نظر انداز کرکے اس نے ایک لامتناہی
جدوجہد اس اُمید میں شروع کردی کہ وہ اپنے حین حیات میں
ہندوستان کی منتشر سیاسی اکائیوں کی شیرازہ بندی میں کامیاب
ہوگا۔ وہ ہندوستان کو اسلامی (مذہبی معنوں میں نہیں) بنانے میں اسی
طرح ناکام رہا۔ جس طرح سکندر ایشیا کو یونانی بنانے میں ناکام ہوا۔
بہرحال انگریز قدیم اقوام کے سیاسی تجربات سے پوری طرح مسلح ہوکر
آئے۔ اور جہاں اورنگ زیب کی عجلت پسند عبقریت ناکام ہوئی
تھی وہاں انگریز کا صبر اور کچھوے والا استقلال کامیاب ہوا۔ فتح کا
مفہوم ضروری نہیں کہ اتحاد ہو۔ مزید برآں پہلے کی مسلم حکومتوں
کی تاریخ نے اورنگ زیب کو یہ تعلیم دی تھی کہ ہندوستان میں اسلام
کی طاقت جیسا کہ ان کے جد بزرگ اکبر نے خیال کیا تھا۔ اس سرزمین
کے باشندوں کی نیک نیتی پر اتنی زیادہ منحصر نہیں ہے۔ جتنی حکمراں

قوم کی طاقت پر۔ بہ ہر حال اپنے تمام گہرے سیاسی ادراک کے باوجود وہ اپنے اسلاف کے اعمال کو محو نہ کر سکا۔ شیواجی دورِ اورنگ زیب کی پیداوار نہیں۔ اس مرہٹہ کا وجود اکبر کی حکمتِ عملی سے پیدا ہونے والی سماجی اور سیاسی طاقتوں کا مرہونِ منت ہے۔ اورنگ زیب کی سیاسی بصیرت اگرچہ صائب تھی۔ لیکن بہت زیادہ موخر تھی۔ پھر بھی اس بصیرت کی اہمیت کے پیشِ نظر اورنگ زیب کو ہندوستان میں مسلم قومیت کا بانی تسلیم کرنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلیں میری باتوں کی صداقت کو ایک دن تسلیم کریں گی۔ ہندوستان کے انگریز حکمرانوں میں لارڈ کرزن پہلا شخص تھا۔ جس نے سب سے پہلے ہندوستان میں انگلینڈ کی طاقت کی حقیقت کا اِدراک کیا۔ ہندو قومیت غلطی سے اس کی پالیسی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وقت یہ بتا دے گا کہ ہندو قومیت لارڈ رپن کی حکمتِ عملی کی رہینِ منت ہے۔ اس لئے یہ واضح ہے کہ اپنے سیاسی مقصد اور بصیرت میں مغل اور انگریز دونوں ایک ہیں۔ میری سمجھ میں کوئی وجہ نہیں آتی کہ انگریز مورخ اورنگ زیب کو کیوں معتوب کرتے ہیں۔ جس کے ہم وطنوں نے اس کے شاہانہ مقاصد کی پیروی کی ہے۔ اور اس کے سیاسی ادراک کی توثیق کی ہو۔ اورنگ زیب کا سیاسی طریقہ کار یقیناً بہت سخت تھا لیکن اس کے اصول کی اخلاقی قدر و قیمت کو اس کے عہد کے میزان پر پرکھنا چاہیئے۔ جس میں اس نے زندگی بسر کی اور اپنے کارنامے انجام دیئے۔

۳۲

فتحِ فارس

اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ تاریخ اسلام کا کون سا اہم ترین واقعہ ہے؟ تو میں بلا کسی تامل کہوں گا کہ فتح فارس۔ نہاوند کی جنگ نے عربوں کو صرف ایک خوب صورت ملک ہی نہیں دیا۔ بلکہ ایک قدیم تہذیب بھی دی۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ایک ایسی قوم، جو سامی اور آریائی سرمایہ سے ایک نئی تہذیب کو پروان چڑھا سکی۔ ہماری مسلم تہذیب سامی اور آریائی تصورات کی باہمی ربط وضبط کی پیداوار ہے۔ یہ وہ نومولود ہے، جسے اپنی آریائی ماں کی نرمی اور لطافت اور سامی باپ کا خالص کردار ورثتاً ملا ہے۔ لیکن فتحِ ایران کے بغیر اسلامی تہذیب ایک رُخی رہتی۔ فتحِ ایران نے ہمیں وہی دیا جو فتحِ یونان نے رومیوں کو دیا تھا۔

۳۳

غالبؔ

میری نظر میں، مرزا غالب فارسی شاعر کی حیثیت سے عام مسلم ادبیات میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کا غالباً واحد مستقل اضافہ ہے۔ بلاشبہ وہ ان شاعروں میں سے ایک ہے، جن کا ذہن وتخیل اسے نسل وقومیت کے تنگ حدود سے بلند تر مقام پر فائز کرتا ہے۔ غالب کی عظمت کا اعتراف ابھی ہونا ہے۔

۳۴

سرپرستیِ اقوام

ایک بے غرض بیرونی حکومت ناممکنات میں سے ہے۔ پھر بھی قوموں کی سرپرستی ایک ضرورت ہے۔ اس اتالیقی کا معاوضہ ایک پوری قوم کا معاش ہوتا ہے۔ میکسیکو کے باشندوں کو اپنے معاملات کی ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے اسپینیوں کے تحت تربیتِ شاقہ سے گزرنا پڑا تھا۔

۳۵

کسی نظم کی مقبولیت

کسی نظم کی مقبولیت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ اس میں منطقی صداقت کی مقدار کیا ہے۔ گولڈ اسمتھ کی "ویران گاؤں" بہت زیادہ مقبول ہے۔ لیکن پھر بھی یہ نظم سائنسی غلطیوں اور ناقص معاشی استدلال سے بھری ہوئی ہے۔

۳۶

ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈس ورتھ

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈس ورتھ سے بہت کچھ لیا ہے۔ اول الذکر دونوں شاعروں نے اشیا کے "اندروں" تک پہنچنے میں میری رہبری کی۔ تیسرے اور چوتھے نے مجھے یہ سکھایا کہ شاعری کے مخیر ملکی تصورات کو جذب کرنے کے بعد بھی جذبہ و اظہار میں کیسے مشرقیت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اور موخر الذکر نے میری طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا۔

۳۷

حکایتیں

گھریلو حکایتوں کی صورت میں زندگی کی گہری سچائیوں کو سمجھانے میں غیر معمولی ذہانت درکار ہوتی ہے۔ شیکسپیئر، مولانا جلال الدین رومی اور عیسیٰ مسیح اس نادر قسم کی ذہانت کی شاید تنہا مثالیں ہیں۔

۳۸

تہذیب کو یہودیوں کی دین

عالمی تہذیب کے فروغ میں یہودیوں کے حصّے کی مقدار کو ناقابلِ اعتنا نہیں سمجھا جا سکتا ۔ یہودی ہی غالباً اس تجارتی اخلاق کے اصولوں کے پہلے مرتبین رہے ہیں ۔ جن کو پاک بازی کے تصور میں سمویا جاتا ہے ۔

۳۹

میزنی

میزنی کا اصل میدان ادب ہے نہ کہ سیاست ۔ سیاست سے میزنی کے اس گہرے انہاک کی وجہ سے دنیا کو جو نقصان پہنچا ہے ۔ اس کا مقابلہ اس فائدے سے نہیں کیا جا سکتا جو اطالیہ کو ہوا ۔

۴۰

سائنس کا انحصار ــــ مابعد الطبعیات پر

جدید سائنس کو مابعد الطبعیات پر خندہ زن نہیں ہونا چاہیئے ۔ کیوں کہ یہ عالم مابعد الطبعیات لائینبز تھا ۔ جس نے

سب سے پہلے سائنس کو مادے پر کام کرنے کا تصور دیا۔
اس نے کہا، کہ مادہ لازماً ایک "طاقت"۔ "مزاحمت" ہے۔
سائنس اس خیال کو مابعد الطبعیات سے مستعار لے کر خود کو اس
طاقت کے مطالعہ کردار میں مصروف رکھتی ہے۔ اور یہ واضح ہے
کہ سائنس خود سے اس کا پتہ نہیں لگا سکتی تھی۔

۴۱

جدید سائنس اور جمہوریت

تصورات کا باہمی طور پر ایک دوسرے پر عمل اور ردِ عمل
ہوتا ہے۔ سیاست میں انفرادیت پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان
کے اثرات سے معاصر سائنسی افکار محفوظ ہیں۔ جدید فکر کائنات
کو زندہ سالمات کی ایک جمہوریت سمجھتی ہے۔

۴۲

تصورات کا ان کے تاریخی سیاق وسباق سے تعلق

ارتقائے فکر کو انسانی سرگرمی کے دوسرے پہلوؤں سے
علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفہ کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ متعدد اقوام
نے کیا غور و خوض کیا ہے۔ لیکن ان متعدد سماجی اور سیاسی اسباب

کو نہیں بتاتیں جنھوں نے فکرِ انسانی کی امتیازی کردار کو متعین کیا ہے۔ مکمل تاریخِ فلسفہ کی تدوین ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔ خالص عالمِ دین اپنے قاری پر " اصلاحِ لوتھر" کے فکر انگیز خیالات، منکشف نہیں کر سکتا۔ ہم عظیم تصورات کو فکرِ انسانی کی سرگرمیوں کے تمام دھارے سے علٰحدہ کرنے کی طرف مائل ہیں۔

۴۳

تعددِ ازدواج

تعدادِ ازدواج کے ادارہ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کو عالم گیر کیا جائے۔ اس کے قیام کی اجازت اس لئے دی گئی تھی کہ اُن دشواریوں پر قابو حاصل کیا جائے۔ جو صرف مسلم معاشرہ ہی کے لئے مخصوص نہیں تھیں۔ اسلام کے نزدیک حلال چیزوں میں بدترین طلاق ہے۔ جزوی طور پر مُبادا طلاق ایک عام رواج بن جائے۔ تعددِ ازدواج کو گوارہ کیا گیا۔ طلاق اور تعددِ ازدواج دونوں سماجی برائیوں (برائیاں اگر عام ہوجائیں) کے مقابلہ میں موخر الذکر یقیناً کم تر درجہ کی برائی ہے۔ لیکن طلاق سے گریز ہی تعددِ ازدواج کے رواج کا شاید تنہا جواز نہیں ہے۔ یہ جزوی طور پر مردوں کی فطرت کے لئے ایک رعایت ہے۔ جس کو اس ادارہ کے تحت اپنے میلان تنوع پسندی سے استفادہ کی اجازت حاصل ہے۔ لیکن وہ اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

انگلینڈ میں فرد بعض حالات میں، ان تشویقات میں ملوث تو ہو جاتا ہے۔ لیکن قانون اس کو ان فرائض کی ادائیگی سے بالکل بری الذمہ رکھتا ہے۔ جو اس جنسی آزادی کے نتیجہ میں اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اپنے پیدا کئے ہوئے بچوں کی تعلیم و تربیت کا وہ ذمہ دار نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسے بچے اپنے باپ کی وراثت پا سکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں تو نتائج بڑے ہی بھیانک ہوتے ہیں۔ فرانس جسم فروشی کو ایک سماجی ادارہ ماننے کے لئے مجبور ہو چکا ہے۔ اور اس ادارہ کو صحت مند رکھنا سرکار کی مکروہ ذمہ داری ہے۔ یک زوجگی پر شاید سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ کئی یورپی ملکوں میں بے ضرورت زائد عورتوں کا وجود ہے۔ ان ملکوں میں ایک سماجی اور سیاسی نوعیت کی مختلف قوتیں شوہروں کی سرپرستی سے محروم عورتوں کی تعداد کو فروغ دے رہی ہیں وہ مائیں نہیں بن سکتیں۔ نتیجتہً وہ بچوں کی پرورش کے مقابلہ میں دوسری دلچسپیوں کی تلاش کے لئے مجبور ہیں۔ وہ اپنے بطن میں بچوں کی جگہ خیالات کی پرورش ....

کے لئے مجبور ہیں۔ حال میں ہی عورتوں کو حق رائے دہندگی عطا کرنے کا نشاط آفریں خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوا ہے۔ یہ دراصل انہی فاضل عورتوں ہی کی کوشش ہے۔ یا اگر آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طرف سے میدانِ سیاست میں ان کے لئے دلچسپیاں پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اگر کوئی سماج اپنی عورتوں کے بچوں کی پیدائش و پرورش کی اجازت نہیں دے سکتا تو انہیں کچھ اور دیگر چیزیں ملنی چاہئیں۔ جن میں وہ مصروف رہیں۔ یورپ میں عورتوں

کے لئے حقِ رائے دہندگی کی تحریک بنیادی طور پر ووٹوں سے زیادہ شوہروں کی خواہش ہے۔ میرے نزدیک یہ بے کار افراد کے فساد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

۴۴

جرمن قوم کے روحانی تصوّرات

یہ وہ کتابیں نہیں ہیں جو گیلیلی کے ماہی گیروں سے منسوب ہیں۔ بلکہ یہ گوئٹے کی "فاؤسٹ" ہے۔ جو جرمن قوم کے روحانی تصورات کا انکشاف کرتی ہے، اور باشندگانِ ملک جرمنی اس سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

۴۵

اپنے دشمنوں سے محبّت

محبت اکسیر سے بھی فزوں تر ہے۔ موخر الذکر معمولی دھات کو سونے میں بدل دینے والا تصور کیا جاتا ہے۔ جب کہ محبت سارے جذبات کو اپنے میں ہی تبدیل کر لیتی ہے۔ عیسیٰ مسیح اور مہاتما بدھ مزاجِ محبت کے اِدراک میں بالکل صحیح تھے۔ لیکن اپنے اخلاقی مثالیت کے جوش میں انھوں نے زندگی کے حقائق کو نظر انداز کر دیا۔ آدمی سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنے دشمنوں سے پیار کرے گا، ایک

زیادتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ غیر معمولی افراد نے اس حکمت پر اپنی زندگی میں عمل کیا ہو لیکن قومی اصولِ اخلاق کی حیثیت سے یہ ضابطہ پاش پاش ہوجاتا ہے۔ اگر جاپانی ان اخلاقی اصولوں پر کاربند ہوتے جو اُن کے مذہب سے وابستہ ہیں تو جنگِ روس وجاپان کے نتائج کچھ اور ہوتے۔

۴۶

تصورات

افراد اور قومیں ختم ہوجاتی ہیں۔ مگر ان کے بچے یعنی تصورات کبھی ختم نہیں ہوتے۔

۴۷

بارِ فرنگ

ایک مرتبہ ایک شریف انگریز نے مجھ سے کہا کہ میں یہودیوں سے نفرت کرتا ہوں کیوں کہ وہ لوگ اپنے کو خدا کی برگزیدہ قوم مانتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے۔ جس میں دوسری قوموں کی تضحیک مضمر ہے۔ اور شاید جواز بھی شامل ہے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ "بارِ فرنگ" کے محاورے میں وہی صہیونی عقیدہ ایک دوسرے لباس میں پوشیدہ ہے۔

۴۸

گوئٹے کا فاؤسٹ

گوئٹے نے ایک عام افسانہ کو منتخب کیا اور اس کو انیسویں صدی کے پورے تجربے ہی سے نہیں بلکہ نسلِ انسانی کے تمام تر تجربے سے معمور کر دیا۔ ایک عام افسانہ کا انسان کے اساسی تصور کی منظّم اظہار میں ڈھل جانا الہامی ہنرمندی سے کم نہیں۔ یہ اتنی ہی خوبصورت ہے جیسے کہ بے ہیئت منتشر مادے سے ایک حسین کائنات کی تخلیق۔

۴۹

ملٹن

ملٹن کی خالص مذہبیت ہمارے عہد کے ذہن کو متاثر نہیں کر سکتی۔ بہت کم لوگ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ والٹیر کا یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ملٹن کی مقبولیت بڑھتی جائے گی۔ کیوں کہ کوئی بھی شخص اسے نہیں پڑھتا۔ ملٹن میں بہ ہر حال ایک بات ہے۔ کوئی دوسرا شاعر اپنی تخلیق کے کام میں اتنا سنجیدہ نہیں رہا ہے جتنا ملٹن۔ اس کا اسلوب، جو جھوٹے خداؤں سے منسوب ایک عظیم الشان تعمیر ہے۔ وقت کے مفلوج ہاتھوں سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

۵۰

اوسکر وائلڈ کی روح

اوسکر وائلڈ کی روح انگریزی سے کہیں زیادہ ایرانی ہے۔

۵۱

قزاق قومیں

مسرف فطرت کا اپنا زائیدہ ہے۔ وہ پسند نہیں کرتی کہ دولت کے بڑے ذخائر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہوں۔ جب ایک خاندان کا بنانے والا دولت اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو یہ اکثر ہوتا ہے کہ اس کی تیسری یا دوسری ہی پشت میں کوئی نہ کوئی فضول خرچ پیدا ہو جاتا ہے اور پوری دولت کو برباد کر دیتا ہے، اگر فطرت کا یہ نمائندہ نہ ہو تو دولت کی گردش رک جائے۔ جو افراد کے لئے درست ہے۔ وہی قوموں کے لئے بھی صحیح ہے۔ جب کوئی قوم صنعت یا کسی اور طریقہ پر دولت جمع اور ذخیرہ اندوزی کر کے عالمی صنعتی سرگرمیوں کو معطل کر دیتی ہے۔ کیوں کہ اس کی کارکردگی سرمائے کے مسلسل گردش میں رہنے پر ہی منحصر ہے تو ایسے وقت میں قزاق قومیں نمودار ہوتی ہیں اور مفید دولت کو آزاد کر دیتی ہیں۔ وارن ہیسٹنگس، کلایو اور محمود ایسی ہی قوموں کے نمائندے ہیں۔ جو دنیا کی صنعت کاری کے فروغ

میں فطرت کے غیر شعوری نمائندہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ وارن ہیسٹنگس کی قزاقی سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے یوروپی سکوں کے رواج کی تاریخ میں اپنا صحیح تشریح پیش کرتی ہے ۔

۵۲

انسان کی یادداشت

انسانوں سے ملنے والے صدمات کے علاوہ انسان کی یادداشت عام طور پر خراب ہوتی ہے ۔

۵۳

مسلم ملکوں میں تفریحات

مسلم ملکوں میں تفریحات نہیں ۔ نہ تو تھیٹر ، نہ موسیقی ہال ، نہ نغمہ وسرود کے جلسے ، اور یہ بہت بہتر ہے ۔ خواہشِ تفریح ایک بار مطمئن ہوجانے کے بعد جلد ہی ناقابلِ تسکین بن جاتی ہے ۔ یوروپی ملکوں کا تجربہ اس افسوس ناک صداقت کی بین مثال ہے ۔ مسلم ملکوں میں تفریح کی غیر موجودگی نہ تو غربت ظاہر کرتی ہے ۔ نہ کفایت شعاری ، اور نہ احساسِ طرب سے بے حسی ۔ بلکہ اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ ان ممالک کے باشندے اپنے گھروں کے پرسکون حلقوں میں وافر نشاط و خوشی حاصل کرتے ہیں ۔ یورپی نقادوں کو مسلم گھروں کی ملامت میں اس عجلت سے کام نہیں لینا چاہیئے ۔ مجھے تسلیم ہے کہ بیرونِ خانہ تفریح سے بے اعتنائی، خانگی مسرت کا لازمی عنصر نہیں اور نہ ہی تفریح سے شوق کا لازمی مفہوم خانگی عدم مسرت ہے ۔

۵۴

اقلیتوں کی طاقت

دنیا کی قسمت کا فیصلہ علی الخصوص اقلیتوں کے ذریعہ ہوا ہے تاریخِ یورپ اس مقدمہ کی صداقت پر وافر دلائل رکھتی ہے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نفسیاتی سبب ہے کہ اقلیتیں کیوں تاریخِ انسانی میں ایک طاقت ور عنصر رہی ہیں ۔ کردار ایک ایسی مخفی قوت ہے، جو اقوام کی تقدیر متعین کرتا ہے ۔ اور اکثریت میں مستحکم کردار کا وجود ناممکن ہے ۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے کہ جتنی زیادہ پھیلتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ کمزور ہوتی ہے ۔

۵۵

تشکیک اور مذہب

کچھ لوگ ہیں جو مائل بہ تشکیک ہیں، لیکن مذہب کی جانب میلان بھی رکھتے ہیں۔ فرانس کا مستشرق رینان اپنی لاادریت کے باوجود اپنے ذہن کے بنیادی مذہبی کردار کا اظہار کرتا ہے۔ ہمیں انسانی طرزِ فکر کی بنیاد پر انسانوں کے کردار کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے میں محتاط رہنا چاہیے۔

۵۶

عربی شاعری

"میرے چچا کالڑ کا پہاڑ کے آگے نکلے ہوئے عمودی حصے کے کنارے ٹہل رہا ہے۔ کیا میں جاؤں اور اسے پیچھے سے چٹان کی وادی سے گرادوں کہ وہ فی الفور ختم ہو جائے۔ اس کا سلوک دیکھ کر میں ایسا کرنے میں حق بہ جانب ہوں۔ لیکن یہ کام ذلیل اور غیر انسانی ہے۔"

ایک عرب شاعر حماسہ میں ایسا کہتا ہے۔ اس اقتباس کو عربی شاعری کا مخصوص نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔ کوئی بھی شاعری اتنی راست انداز، صاف گو اور روح کے اعتبار سے اتنی پُر قوت

نہیں ہے۔ عرب قوم حقیقت سے بہت ہی گہری وابستگی رکھتی ہے۔
اس کے لئے رنگوں کی چمک دمک پُرکشش نہیں ہوتی۔ متنبی کو بہرحال
اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں وہ صرف زبان کے اعتبار
سے عربی شاعر ہے۔ اصل مزاج کے اعتبار سے وہ مکمل فارسی
شاعر ہے۔

۵۷

حیرت

افلاطون کہتا ہے کہ حیرت ہی تمام علوم کی ماں ہے۔ مرزا
عبدالقادر بیدؔل جذبۂ حیرت کو دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں
وہ کہتے ہیں:

نزاکت ہاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را۔

افلاطون کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اس لئے ہے کہ یہ کبھی
ہمیں فطرت سے استفسار کی ترغیب کرتی ہے۔ بیدؔل کے نزدیک، اس
کے فطری نتائج سے قطع نظر، اس کی بجائے خود اپنی قیمت ہے۔ اس
خیال کا بیدؔل سے زیادہ خوب صورت اظہار ناممکن ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا نازک دور

جہاں تک مذہبی خیالات کے ارتقا کا تعلق ہے کسی ایک ملت کی ترقی میں خاص طور پر تین مدارج ہوتے ہیں۔

(۱) روایتی مذہب کی طرف تشکیک کا رجحان ۔۔ اذعانی عقیدہ کے خلاف ایک بغاوت۔

(۲) لیکن ایک قابلِ قدر معاشرتی طاقت کی حیثیت سے مذہب کی ضرورت کو بالآخر محسوس کیا جاتا ہے۔ اور تب دوسری منزل پر مذہب کو عقل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع ہوتی ہے۔

(۳) یہ کوشش لازماً اختلاف رائے کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس کے نتائج کسی فرقہ کے وجود کے لئے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ یہ اختلافِ رائے، اگر مخلصانہ نہیں ہے، (اور بدقسمتی سے عام طور پر ایمان دارانہ نہیں ہوتا) تو یہ شیرازہ بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان آج اس تیسری منزل پر ہے، یا شاید جزوی طور پر دوسری، اور جزوی طور پر تیسری منزل پر ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ملی زندگی میں یہ دور بہت زیادہ نازک ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ مختلف النوع قوتیں مصروفِ کار ہیں۔ جن میں اتحادِ ملت کو محفوظ رکھنے کا رجحان موجود ہے۔ حالاں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کا اثر محض عارضی ہوگا۔

۵۹

تاریخ کی تعبیر

تاریخ انسانی مقاصد کی طرف ایک تعبیر ہے۔ اور چوں کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں اپنے معاصرین، اپنے خاص احباب، اور متعلقین کے مقاصد کی غلط تعبیر کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس لئے صدیوں پہلے رہنے والوں کے مقاصد کی صحیح باز آفرینی تو کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس لئے تاریخ کے دستاویزات بڑے احتیاط سے قبول کرنے چاہیئے۔

۶۰

مساوات

کسی تصور کی عملی طاقت اس شخصیت کی قوت پر منحصر ہوتی ہے۔ جس میں یہ خود محصور ہوتی ہے۔ حضرت محمدؐ، گوتم بدھ، اور عیسیٰ مسیح تصورِ مساوات کے عظیم پیکر ہیں۔ پھر بھی دنیا میں صرف اسلام ہی وہ طاقت ہے، جو ہنوز مساوات کی سمت سرگرم عمل ہے۔

۶۱

اشیا کی قدر و قیمت

خدا نے اشیا کی تخلیق کی۔ انسان نے اشیا کی قدر و قیمت دریافت کی۔ نطشے نے کہا ہے کہ کسی ایک قوم کی بقا اس کے قدر و قیمت کی پیہم تخلیق پر منحصر ہے۔ اشیا پر حکمتِ الٰہیہ کی مُہر ضرور ثبت ہوتی ہے۔ لیکن ان کی معنویت سر تا سر انسانی ہے۔

۶۲

مقصدِ تعلیم

"قانونِ اشیا کیا ہے؟ ـــ پیہم جد و جہد۔ تو پھر تعلیم کا کیا مقصد ہو گا۔؟ ـــ بہ ظاہر جد و جہد کے لئے تیاری۔ جو قوم فکری برتری کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ وہ اپنے ضعف کا اظہار کرتی ہے۔

۶۳

خدا طاقت ہے

طاقت سچائی کے مقابلہ میں زیادہ الہامی ہے۔ خدا طاقت ہے۔ پھر تو ـــ تو بھی بہشت میں رہنے والے، اپنے خالق کی طرح بن جا۔

۶۴

طاقت ور انسان

طاقت ور انسان ماحول کی تخلیق کرتا ہے اور ناتواں خود کو اس ماحول میں ڈھالتا ہے۔

۶۵

لمسِ قوت

طاقت جھوٹ کو مس کرتا ہے، تو یہ سچائی میں بدل جاتا ہے۔

۶۶

طاقت ور انسان کی فکر

تہذیب ایک طاقتور انسان کی فکر ہے۔

۶۷

انتظارِ مہدی

طاقت کے مظہر مہدی (موعود) کا انتظار ترک کردو — جاؤ — اور اسے پیدا کرو۔

۶۸

تصورِ قومیت

ملتوں کی نشوونما میں تصورِ قومیت یقیناً ایک صحت مند عنصر ہے۔ لیکن اس میں غلو کا بھی امکان ہے اور جب اس میں غلو ہوتا ہے۔ تو ادب و فن میں وسیع انسانی عناصر کے خاتمے کا میلان پیدا ہوجاتا ہے۔

۶۹

کانٹ کی منطقی قطعیت

جو جرمن قوم کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ سے واقف نہیں وہ کانٹ کی منطقی قطعیت کی اہمیت کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ کانٹ کے تصورِ فرض کی شدّت اس میں اپنی مکمل وضاحت رکھتی ہے۔

۷۰

زوال آمادہ نظام میں نئی زندگی پیدا کرنا

ایک بگڑا ہوا سماجی نظام کبھی کبھی اپنے اندر ہی ایسی قوتیں

بیدار کرتا ہے، جس میں ہیئتِ اجتماعیہ کی صحت مندی کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ یعنی ایک عظیم شخصیت کا وجود۔ جو ایک نئے نصب العین کے اظہار سے زوال آمادہ نظام میں زندگی کی نئی روح پھونکتا ہے۔

ضبطِ نفس

افراد کا ضبطِ نفس خاندانوں کی تشکیل کرتا ہے۔ قوموں کا ضبطِ نفس ــــ مملکتوں کا خالق ہوتا ہے۔

بُت پرستی

اسلام اور عیسائیت دونوں کو ایک ہی دشمن یعنی بُت پرستی سے سامنا کرنا پڑا۔ فرق صرف یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے حریف سے مصالحت کرلی۔ اسلام نے تمام وکمال اُسے نیست ونابود کردیا

۷۴

مسلم قوم کی حیرت انگیز تاریخ

آپ مسلم قوم کی تاریخ پر جتنی زیادہ نظر ڈالیں گے۔ اتنی ہی زیادہ حیرت انگیز دکھائی دے گی۔ اس کے آغاز کے ابتدائی ایام سے سولھویں صدی کی ابتدا تک ، تقریباً ایک ہزار سال تک یہ طاقت ور نسل — (چوں کہ اسلام نے ایک نسل ساز قوت کے طور پر فرض انجام دیا ہے۔ اس لئے میں اسے نسل کہتا ہوں)۔ سیاسی توسیع پسندی کے ہمہ گیر کاموں میں مسلسل مصروف رہتے ہوئے بھی مسلسل عمل کے طوفان میں اس حیرت انگیز قوم نے کافی وقت پایا کہ قدیم علوم کے خزانوں کی دریافت کرے، اور اس کو محفوظ رکھے، ان میں قابلِ قدر اضافہ کرے، ایک نادر کردار کے حامل ادب کی تخلیق کرے، اور ان سب سے بڑھ کر ایک مکمل ضابطہ، قانون کو فروغ دے۔ جو سب سے زیادہ بیش قیمت میراث ہے۔ جسے مسلم فقہا نے چھوڑا ہے۔

۷۵

اس دنیا کی تشکیلِ نو

گناہ اور پریشان حال اس دنیا کو کردار اور صحت مند تخیّل دے کر حقیقی بہشت کی تشکیلِ نو ممکن ہے۔

۷۵

تکلیف

غم ایک خدائی عطیہ ہے تاکہ انسانوں کو پوری زندگی کا ادراک ہو سکے۔

۷۶

لامتناہیت

ایک ریاضی داں مجبور ہے، مگر ایک شاعر لامتناہیت کو ایک مصرع میں قلم بند کر سکتا ہے۔

۷۷

شاعر اور روحِ عالم

روحِ عالم اپنی باطنی زندگی کی مختلف صورتوں کو علامتوں میں پوشیدہ رکھتی ہے۔ کائنات ایک بڑی علامت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن وہ ہمارے لئے ان علامتوں کی ترجمانی کی زحمت کبھی بھی گوارا نہیں

کرتی - یہ شاعر کا فرض ہے کہ وہ ان کی ترجمانی کرے - اور بنی نوع انسان پر ان کے اسرار منکشف کرے - اس سے ظاہر ہوگا کہ شاعر اور روحِ عالم ایک دوسرے کے مخالف ہیں - کیوں کہ شاعر ان اسرار کی نقاب کشائی کرتا ہے، جسے روحِ عالم پوشیدہ رکھتی ہے -

۷۸

مبہم و مغلق

میتھو آرنلڈ بہت ہی جامع شاعر ہے - مجھے شاعری میں ابہام و اغلاق کا ایک پہلو بہ ہر حال پسند ہے - کیوں کہ ابہام و اغلاق جذبات کے عمیق اظہار ہیں (جذبات کی گہرائی کو بدرجۂ غایت ظاہر کرتے ہیں -) -

۷۹

تاریخ کا گراموفون

تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے - جس میں قوموں کی آوازیں محفوظ ہوتی ہیں -

۸۰

گناہ اور پارسائی

گناہ کم از کم ایک لحاظ سے پارسائی سے بہتر ہے۔ گناہ میں ایک تخیلی عنصر ہے۔ جس سے پارسائی محروم ہے۔

۸۱

نیک لوگ

گناہ خود اپنی ایک تعلیمی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ نیک لوگ اکثر و بیشتر غبی ہوتے ہیں۔

۸۲

فکر بدونِ عمل

زندگی ۔ شاعری اور مصوری کے فن کی طرح تمام تر اظہار ہے۔ فکر بدونِ عمل ہلاکت ہے۔

۸۳

زندگی میں کامرانی

یہ عزم ہے، ذہن نہیں - جو زندگی میں کامراں ہوتا ہے۔

۸۴

عوامی رہ نما ہو جانا

اگر آپ کو عوامی رہ نما بننے کا ارمان ہے تو آپ کو جاننا چاہیئے کہ ناظورۂ عوام کو کیسے رجھایا جاتا ہے۔ بے کار باتوں سے اس کی دل داری کرتے رہیئے اور اگر ضرورت پڑے تو دروغ سے بھی اس کا دل بہلاتے رہیئے۔

۸۵

ایک کامیاب انسان

اپنی معذوریوں کو پہچانو۔ اپنی صلاحیتوں کا اندازہ لگاؤ۔ اور زندگی میں کام یابی یقینی ہے۔

۸۶

کاہل ذہن

کاہل ذہن کچھ ایسی مشین ہے - جو حرکت نہیں کرتی -

۸۷

غم کی اخلاقی قدر و قیمت

کوئی مذہبی نظام غم کی اخلاقی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کر سکتا -

عیسائیت کے معماروں کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے صرف حقیقتِ غم پر ہی اپنے مذہب کی بنیاد رکھی اور دوسرے عوامل کی اخلاقی قدر و قیمت کو فراموش کر گئے - پھر بھی یورپی ذہن کے لئے ایک ایسے مذہبی نظام کی ضرورت تھی، جو خوب صورت مگر یک رخی یونانی تصور میں اضافہ کر سکے - بہ قول گوئٹے - یونانیوں کا خوابِ زندگی یقیناً بہترین تھا - لیکن اسے غم کے رنگین عناصر کی ضرورت تھی - جس کو عیسائیت نے فراہم کیا -

۸۸

بڑا کتب خانہ

اگر آپ کے پاس کوئی بڑا کتب خانہ ہے اور آپ اس کی تمام کتابوں سے واقف ہیں ۔ اس سے تو صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ دولت مند آدمی ہیں ۔ کوئی ضروری نہیں کہ اس کا یہ مطلب ہو کہ آپ صاحبِ فکر بھی ہیں ۔ آپ کے بڑے کتب خانے کا صرف یہ مفہوم ہے کہ آپ کے پاس اتنا مالی سرمایہ ہے کہ آپ کی بجائے سوچنے والے بہت سے افراد کرایہ پر لائے جا سکتے ہیں ۔

۸۹

معجزات

سوال یہ نہیں کہ معجزات واقع ہوئے ہیں یا نہیں ۔ یہ صرف شہادت کا ایک سوال ہے ۔ جس کی مختلف طریقوں سے تعبیر کی جا سکتی ہے ۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معجزات پر یقین کسی ایک فرقہ کے لئے مفید ہے ۔ میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے ۔ کیونکہ ایسا عقیدہ مافوق الفطرت کے شعور کو تیز تر کر دیتا ہے جو قدیم معاشروں کو متحد رکھتا ہے ۔ اور ان معاشروں کو

بھی، (مثلاً اسلام) جن کی، قومیت تصوراتی ہے، علاقائی نہیں۔ سماجی ارتقا کے نقطۂ نظر سے اگر اس پر غور کیا جائے تو معجزات پر یقین تقریباً ایک ضرورت بن جاتا ہے۔

۹۰

جمہوریت

جمہوریت نظم و ضبط کے نشو و نما کا میلان رکھتی ہے۔ یہ بہ ذاتِ خود بری نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے خالص اخلاقی نقطۂ نظر کو بے خانماں، اور غیر قانونی اور غلط کو ہم معنی کر دیتی ہے۔

۹۱

جمہوریت اور شہنشاہیت

یورپ کی متعدد اقوام کے استعمارانہ عزائم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب جمہوریت سے بیزار ہو چکے ہیں۔ انگلینڈ اور فرانس میں جمہوریت کے خلاف ردِ عمل ایک بہت اہم منظر ہے۔ لیکن اس منظر کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے سیاسیات کے طالب علم کو ان خالص تاریخی اسباب کی صرف تحقیق و دریافت سے اپنے کو مطمئن نہیں

کر لینا چاہیے۔ جو اس کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ آ سے اور گہرائی میں
اترنا چاہیے۔ اور اس ردِّ عمل کے نفسیاتی اسباب کی تحقیق کرنی
چاہیئے۔

۹۲

قارئینِ اخلاق

قدمانے شخصیتیں پیدا کیں، اور ہم قارئینِ اخلاق پیدا
کرتے ہیں۔

۹۳

نوجوان پیغمبر اور مسلمان عورت

اصلاحِ معاشرہ کے بارے میں نوجوان پیغمبر سوچتے ہیں کہ
مغربی طرز کے نظامِ تعلیم کی چند خوراک سے مسلم عورتوں کے جسدِ مردہ
میں زندگی نو پیدا ہوگی۔ اور اس طرح وہ اس کو اپنا پرانا کفن تار تار
کرنے پر مائل کر دیں گے۔ یہ شاید صحیح ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ
وہ اپنے آپ کو عریاں پا کر اسے ایک بار پھر اپنا جسم ان نوجوان
پیغمبروں کی نظروں سے بچانا پڑے گا۔

۹۴

شعراء اور اربابِ سیاست

قومیں شاعروں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں اور وہ اربابِ سیاست کے ہاتھوں میں پروان چڑھتی اور فنا ہو جاتی ہیں۔

۹۵

ایک پیغمبر

ایک پیغمبر صرف ایک عملی شاعر ہے۔

۹۶

فلسفہ و شاعری

فلسفہ انسانی تعقل کی برفیلی رات میں کانپتا ہوا جوہر ہے۔ شاعر نمودار ہوتا ہے اور ان کو معروضیت کی حرارت بخش دیتا ہے۔

۹۷
افلاطون اور گوئٹے

فطرت کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکی تھی کہ افلاطون کو شاعر بنائے یا فلسفی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کے معاملہ میں بھی وہ اس حیص بیص میں مبتلا تھی۔

۹۸
روئے زمین پر سب سے دلاویز شے

خود بینی کے احساس سے بے پروا، ایک بہت زیادہ خوب صورت عورت مجھے خدا کی سرزمین پر سب سے زیادہ دلاویز شے لگتی ہے۔

۹۹
طاعت بدونِ عقیدہ

بدونِ عقیدہ، رواداری اور طاعت کا رجحان بھی عامیانہ ذہن کے لئے سب سے زیادہ ناقابلِ فہم شے ہے۔ اگر آپ کا رجحان ایسا ہے تو خاموش بیٹھ رہیئے اور کبھی بھی اپنے موقف کے دفاع کی کوشش نہ کیجئے۔

۱۰۰

راوی کے کنارے غروبِ آفتاب

آپ کے کتب خانے کے تمام حیرت انگیز کتابی علوم کنارِ راوی کے ایک پرشکوہ غروبِ آفتاب کے منظر کے مساوی نہیں۔

۱۰۱

سچی سیاسی زندگی

سچی سیاسی زندگی مطالبۂ حقوق سے نہیں، بلکہ ادائیگیٔ فرض سے شروع ہوتی ہے۔

۱۰۲

ایک حقیقی شادی کی اہمیت

فطرت کے گوناگوں حسن و جمال کا ادراک صرف ایک عاشق کی نگاہوں سے ہوسکتا ہے۔ ایک حقیقی شادی کی یہی اہمیت ہے۔

۱۰۳

خدا اور شیطان

خدا اور شیطان دونوں ہی انسان کو صرف مواقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ کام اس پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ جس طرح مناسب سمجھے انھیں استعمال کرے۔

۱۰۴

شیطان کو سوچو

"شیطان کا خیال کرو۔ وہ یقیناً ظاہر ہوگا۔"
یہ خدا کے لئے بھی اتنا ہی صحیح ہے۔

۱۰۵

ادائے شکر

اے خدا میں تیرا شکر بجا لاتا ہوں کہ تو نے مجھے گل گوں قبا صبحوں، شعلہ پوش غروب آفتاب، اور ان گھنے جنگلوں کی دنیا میں پیدا کیا، جہاں فطرت کی شب ہائے گزشتہ کی تیرگی خواب سرمدی میں آسودہ ہے۔

۱۰۶

ماہرِ نفسیات اور شاعر

ماہرِ نفسیات سطحِ آب پر تیرتا ہے۔ جب کہ شاعر غواصی کرتا ہے۔

۱۰۷

اسناد جمع کرنے کا شوق

ہندوستانی خاندانوں کے ایک طبقہ میں، جس میں بیشتر انگریزی حکومت کے دست پروردہ ہیں۔ یہ رجحان ایک جبلت کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ وہ متعدد حکام سے اسناد لے کر جمع اور شائع کریں۔ یہ عادت کبھی کبھی اپنا اظہار آغازِ طفولیت میں کرتی ہے۔ میں اسے غیر صحت مند ماحول کی وجہ سے پیدا شدہ ایک قسم کی اخلاقی کمزوری سمجھتا ہوں۔

۱۰۸

ذہنِ انسانی کی تشریح

اگر آپ کو ذہنِ انسانی کی تشریح کے مطالعہ کا شوق ہے تو آپ

کو وونڈ، وارڈ، جیمس یا اسٹاوٹ سے رجوع کرنا چاہیئے۔ لیکن آپ فطرت انسانی کی حقیقی بصیرت صرف گوئٹے کے یہاں پا سکتے ہیں۔

۱۰۹

انسان اور لامتناہیت

جس طرح ایک چشمہ کے کنارے اُگا ہوا پودا، اس شیریں و سیمیں موسیقی کو نہیں سنتا، جو اُسے نیچے سے غذا مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح لامتناہیت کے کنارے پر استادہ انسان اس الہامی سرود زریں کو نہیں سنتا۔ جو اس کی روح کو زندگی اور نغمہ و آہنگ عطا کرتا ہے۔

۱۱۰

شاعر بہ حیثیت انسان

میرے پیارے دوست! تو نے مجھے صرف خیالی مفکر اور بلند تصورات کا خواب دیکھنے والا جانا ہے۔ مجھے میرے گھر میں بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھو۔ اور یہ دیکھو کہ میں باری باری اُن کا مرکب بنتا ہوں۔ گویا میں لکڑی کا ایک گھوڑا ہوں۔ ہاں مجھ کو حلقۂ خاندان میں اپنی اس سفید بالوں

والی بوڑھی ماں کے قدموں میں پڑے ہوئے دیکھو۔ جس کے شباب انگیز ہاتھ کا لمس وقت کے دھارے کو پیچھے بہا دیتا ہے۔ اور میرے دماغ میں بسے ہوئے کانٹوں اور ہیگلوں (کانٹ اور ہیگل جیسے بہت سے فلسفیوں) کے باوجود مجھے ایک طفلِ مکتب ہونے کا احساس بخشتا ہے۔ یہاں تو مجھے بہ حیثیت ایک انسان پائے گا۔

۱۱۱

فلسفہ و شاعری کا اثر

فلسفہ بوڑھا بنا دیتا ہے۔ شاعری دوبارہ شباب لاتی ہے۔

۱۱۲

شکسپیر اور گوئٹے

شکسپیر اور گوئٹے دونوں خلقت کے الہامی خیال پر فکرِ نو کرتے ہیں۔ مگر دونوں میں بہ ہر حال ایک اہم فرق ہے۔ حقیقت پسند انگریز فرد پر، مثالیت پسند المانوی کائنات پر فکرِ نو کرتا ہے۔ اس کا فاؤسٹ بہ ظاہر صرف ایک فرد ہے۔ حقیقت میں اس کی شخصیت بنی نوع انسان کا مظہر ہے۔

۱۱۳

لمحہ کی قدر و قیمت

میں اپنے دنوں، مہینوں، اور برسوں کی قیمت کا اندازہ ان تجربات سے کرتا ہوں جو ان کے ذریعہ مجھے حاصل ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ لمحۂ واحد ایک پورے سال کے مقابلہ میں زیادہ گراں قدر ہوتا ہے۔

۱۱۴

تجربہ اور علم

ہر تجربہ انسان کی روح سے کچھ نہ کچھ استخراج کرتا ہے۔ تجربۂ گناہ کا تجزیہ بھی آپ کی روح کے کسی نہ کسی ایسے پہلو کو ظاہر کرے گا، جس سے آپ پہلے واقف نہیں تھے۔ اس طرح تجربہ دہرا ذریعۂ علم ہے۔ وہ آپ کو آپ کے داخل کی بصیرت کے ساتھ ساتھ خارج کی بھی بصیرت عطا کرتا ہے۔

۱۱۵

عامیانہ حقائق

حقائق سے زیادہ عامیانہ کوئی چیز نہیں۔ پھر بھی جب تک کہ بیکن نے ان کی آنکھیں نہیں کھولیں۔ انسان ان سے نابلد رہا۔

۱۱۶

ہوریس، مانٹین اور آزاد

" دوسروں کے دست و بازو ہمیں ہر سمت حرکت

دیتے ہیں اور ہم لکڑی کی طرح لڑھکتے جاتے ہیں اور
کھنچے جاتے ہیں "

مانٹین، ہوریس کے مذکورہ شعر پر تبصرہ کرتا ہے۔

" ہم جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں۔ ان
چیزوں کی طرح، جو پانی کی شورش اور سکون کے مطابق
کبھی سبک رفتاری کے ساتھ اور کبھی بہت تیزی و
تندی کے ساتھ تیرتی پھرتی ہیں۔"

مانٹین کے اس اقتباس کے مطالعے کے وقت مرحوم آزاد کا یہ
یہ شعر میرے ذہن میں آگیا۔ آزاد نے اس خیال کو ہوریس اور مانٹین
سے کہیں زیادہ خوب صورت اظہار بخشا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

" جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں!
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

۱۱۷

ادبی تنقید

کوئی ضروری نہیں کہ ادبی تنقید، تخلیقِ ادب کی تابع ہو۔ ہم لیسنگ کو جرمن ادب کی دہلیز پہ ہی پاتے ہیں۔

۱۱۸

گوئٹے اور ہائنے

کوئی قوم المانوی قوم سے زیادہ خوش بخت نہیں۔ اس نے ہائنے کو اس وقت پیدا کیا۔ جب گوئٹے بھرپور شیریں آواز سے نغمہ سرا تھا۔ ایک ہی وقت میں دو چشمے غیر منقطع طور پر مسلسل ایک ساتھ۔

۱۱۹

حافظ

ہیروں کی طرح تراشیدہ الفاظ میں حافظ نے بلبل کی حلاوت آفریں لاشعور کو سمو دیا۔

۱۲۰

محبّت ایک شوخ بچہ ہے

محبت ایک طفلِ شوخ و شیریں کار ہے ۔ وہ ہماری انفرادیت کی تشکیل کرتی ہے اور بعد ازاں ہمارے کانوں میں خاموشی سے سرگوشیاں کرتی ہے ــ" اسے ترک کر دو"

۱۲۱

تلاشِ دانائی

میں نے اکثر دانائی کے ساتھ آنکھ مچولی کی ہے ۔ وہ ہمیشہ خود کو عزم کی چٹان کے پیچھے چھپا لیتی ہے ۔

۱۲۲

مقصدِ وحید والا انسان

اگر آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا کے شور و غوغا میں آپ کی بات سُنی جائے تو آپ کی روح پہ صرف ایک خیال حادی ہونا چاہئیے ۔ یہ ایک خیال رکھنے والا ہی انسان ہے ۔ جو سیاسی اور سماجی انقلاب پیدا کرتا ہے ۔ وہی سلطنت قائم کرتا ہے اور دنیا کو ضابطۂ قانون دیتا ہے ۔

۱۲۳

صرف فن ہی لامحدود ہے

سائنس، فلسفہ، مذہب سب کے حدود ہیں۔ صرف فن ہی لامحدود ہے۔

۱۲۴

مطلق علم اور اخلاقی نشوونما

تمام فلسفیانہ اذکار کا حاصل یہ ہے کہ مطلق علم ایک ناممکن شے کو بہت ہی نادر دلیل کے ذریعہ اخلاقی استعمال میں بدل دیتا ہے۔ یہ شاعر بتاتا ہے کہ علم انسانی کی بے یقینی اخلاقی نشوونما کے لئے لازمی شرط ہے۔ کیوں کہ مکمل آگہی انسانی قوتِ انتخاب کی آزادی کو فنا کر دیتی ہے

۱۲۵

خوشامد

خوشامد صرف مبالغہ آمیز خوش سلیقگی و خوش گفتاری ہے۔

BIKHRE KHIYALAT

(Urdu Translation of Iqbal's Diary)

STRAY REFLECTIONS

by

Dr. Abdul Haq

URDU DEPARTMENT
Delhi University Delhi.